مکالمہ نویسی

تعریف اور مفہوم:

مکالمہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی گفتگو، زبانی سوال و جواب، ہم کلامی، باہمی گفتگو، باہمی سوال جواب۔

(بحوالہ فیروز اللغات، صفحہ 1338، جدید اُردو لغت صفحہ 677)

اصطلاح میں دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان گفتگو کو مکالمہ کہتے ہیں۔ یہ گفتگو عام طور پر سوال جواب کی صورت میں ہوتی ہے۔

امتحانی پرچے میں یہ سوال نمبر 6 ہوتا ہے۔ اس سوال میں روداد یا مکالمہ لکھنا ہوتا ہے۔ چوں کہ ایک چیز لکھنی ہوتی ہے اس لیے دونوں میں سے ایک چیز تیار کریں تاکہ وقت اور محنت بچ سکے۔ مکالمہ نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

لہٰذا مکالمہ کی تیاری کے لیے ہدایات درج ذیل ہیں۔

1۔ نصابی تقاضے کے مطابق مکالمہ صرف دو افراد کے درمیان ہوتا ہے۔ مکالمہ دو افراد کے درمیان طویل گفتگو کے دوران میں کسی موضوع پر ایک حصے کے طور پر لکھنا چاہیے، تاکہ مکالمہ مصنوعی نہ لگے۔

2۔ مکالمہ سوال میں دیے گئے موضوع پر بحث کے انداز میں لکھا جائے، اس لیے دونوں کردار متضاد سوچ رکھنے والے ہوں تاہم مکالمے کا انجام (جسے ہر حال میں لکھنا چاہیے) دونوں کرداروں کے اتفاق رائے یا مثبت کردار کی فتح یا مرد بازی روی پر ہونا چاہیے۔

3۔ مکالمے کا آغاز اور انجام دونوں فطری ہوں۔ آغاز اور اختتام پر منظر نامہ چھوٹی بریکٹ میں لکھنا چاہیے۔ اسی طرح مکالمے کے درمیان کیفیات خواہ مکالمے سے پہلے یا دورانِ مکالمہ، بریکٹ میں ہی لکھی جانی چاہییں۔

4۔ کرداروں کی پیشہ ورانہ معلومات کا صحیح استعمال کریں۔ کرداروں کی گفتگو، ان کی عمر، مرتبہ، جنس، تعلیم اور پیشے کے مطابق ہونی چاہیے۔ حفظِ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔

5۔ گفتگو روزمرہ بول چال کی اور نجی ہو، مگر شائستگی ملحوظ رکھنی چاہیے۔ گفتگو تصنع اور بناوٹ سے پاک ہو۔ مکالمے مختصر بھی ہو سکتے ہیں اور طویل بھی مگر دونوں صورتوں میں موضوع سے نہ ہٹیں۔

مکالمہ نگاری

مکالمہ جات

بمطابق اُردو قواعد و انشا

(پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ)

1 دو دوستوں کے مابین امتحان کی تیاری سے متعلق مکالمہ

(شعیب لائبریری میں بیٹھا ہے۔ اس کا دوست اویس اس کے پاس آتا ہے اور دونوں میں اس طرح گفت گو ہوتی ہے۔)

اویس: السلام علیکم!

شعیب: وعلیکم السلام!

اویس: یار! ڈیٹ شیٹ آ گئی ہے۔ تم نے امتحان کی تیاری کے متعلق کیا سوچا ہے؟

شعیب: ہاں بھئی! امتحان سر پر ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تیاری کیسے کی جائے۔

اویس: سارا سال کالج اور گھر میں پڑھتے رہے ہیں۔ اس لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

شعیب: تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں، لیکن امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے کی فکر ہے۔

اویس: آج کل کالج میں باقاعدگی سے تمام مضامین کے ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ اس سے ہماری تیاری بہت اچھی ہو رہی ہے، پھر بھی مجھے فزکس اور انگلش میں مشکل پیش آ رہی ہے۔

شعیب: تم فکر نہ کرو، ہم دونوں مل کر تیاری کریں گے۔ ان دونوں مضامین کی تیاری میں، میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔

اویس: یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

شعیب: ریاضی کے سوا تمام مضامین میں میری تیاری اچھی ہے۔ بس ذرا ریاضی میں مشکل پیش آ رہی ہے۔

اویس: ریاضی میں میری تیاری بہت اچھی ہے۔ میں ایک دفعہ ریاضی کی پوری کتاب کی دہرائی بھی کر چکا ہوں۔ تمھیں ریاضی میں کیا مشکل پیش آ رہی ہے؟

شعیب: ریاضی کے آخری دو اسباق کی اچھی طرح سمجھ نہیں آئی۔ اس کا سلیبس بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ میں آخری دنوں میں ریاضی کی کلاس باقاعدگی سے نہیں لے سکا۔ اس لیے اب ذرا مشکل محسوس ہو رہی ہے۔

اویس: تم فکر نہ کرو۔ امتحان کی تیاری کے لیے ہم پڑھائی کا ایک شیڈول بنا لیتے ہیں۔ پھر اس کے مطابق باقاعدگی سے تمام مضامین کی اچھی طرح تیاری کر لیں گے۔

شعیب: یہ ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر مضمون کو ایک ایک گھنٹہ دینا چاہیے۔ جس مضمون میں کوئی مشکل محسوس ہو، اسے زیادہ وقت دے کر اچھی طرح تیار کیا جائے۔

اویس: یہ طریقہ ٹھیک رہے گا۔ فزکس اور انگلش کے مضامین میں تم میری مدد کرنا اور ریاضی کے مضمون میں، میں تمھاری رہنمائی کروں گا۔ ان شاء اللہ، اس طرح ہمارے کمزور مضامین کی تیاری بھی اچھی ہو جائے گی۔

شعیب: اگر ہم اس شیڈول کے مطابق امتحان کی تیاری کریں تو ہم ان شاء اللہ اچھے نمبر لینے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

اویس: لیکن ہم اکٹھے بیٹھ کر کہاں تیاری کریں گے اور کب شروع کریں؟

شعیب: یہ کون سا مسئلہ ہے؟ تم میرے گھر آ جایا کرو۔

اویس: میرے روزانہ آنے سے تمھارے گھر والوں کو کوئی مشکل تو نہیں ہوگی؟

شعیب: بالکل نہیں۔ ہمارے پاس ایک الگ کمرا ہے، وہاں کسی کا آنا جانا نہیں۔ میں وہیں بیٹھ کر مطالعہ کرتا ہوں۔

اویس: یہ تو بہت اچھا ہے۔ میں آج ہی سے شام کو عصر کے وقت تمھارے پاس آ جاؤں گا۔

شعیب: ضرور۔ ان شاء اللہ مغرب کی نماز بھی ہم اکٹھے مسجد میں باجماعت ادا کیا کریں گے۔

اویس: مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے سے ہم تازہ دم بھی ہو جائیں گے اور ہم جو بھی پڑھا کریں گے، اللہ تعالیٰ نماز کی برکت سے اس میں آسانی فرمائیں گے۔

شعیب: جی بالکل، پہلے ہم کلاس میں ہونے والے ٹیسٹوں کی تیاری کیا کریں گے، اس کے بعد جن مضامین کی تیاری اچھی نہیں، انھیں زیادہ وقت دیا کریں گے۔

اویس: فزکس اور انگریزی کے علاوہ باقی مضامین میں میری تیاری بہت اچھی ہے۔

شعیب: فزکس اور انگریزی کی تیاری میں، میں تمھاری مدد کروں گا۔ ان شاء اللہ، ان کی تیاری بہت اچھی ہو جائے گی۔

اویس: فزکس میں مجھے نمیریکلز (Numericals) حل کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ابواب ایسے ہیں، جنھیں میں نے رٹا لگا رکھا ہے، اس لیے ذہن سے نکل جاتے ہیں۔

شعیب: محض رٹا لگانے سے چیزیں یاد نہیں رہتیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ رٹا لگانے کی بجائے سبق کو سمجھ کر یاد کریں۔ جہاں مشکل محسوس ہو وہاں اپنے اساتذۂ کرام سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

اویس: ان شاء اللہ، اب ایسا ہی کریں گے۔ اساتذہ کرام کی رہنمائی سے کسی مضمون میں کوئی مشکل نہیں رہے گی۔

شعیب: ہمیں تمام مضامین پر بھرپور توجہ دینی چاہیے۔ اچھے نمبر حاصل کرنے کے لیے ہمیں کسی بھی مضمون کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

اویس: ٹھیک کہا تم نے۔

شعیب: آج کی گفت گو خوب رہی۔ یقیناً اب امتحان کی تیاری میں کافی آسانی ہوگی۔

اویس: ان شاء اللہ، ہم ایک دوسرے کے تعاون سے اچھے طریقے سے امتحان کی تیاری کر لیں گے۔

شعیب: ان شاء اللہ، ہم دونوں مل کر امتحان کی تیاری کریں گے۔ اب ہمیں جماعت کے کمرے میں چلنا چاہیے، کیوں کہ اُردو کا لیکچر شروع ہونے والا ہے۔

اویس: کیوں نہیں، آؤ چلیں۔

شعیب: شام کو تم میرے پاس آؤ گے تو پڑھائی کے شیڈول کو حتمی شکل دیں گے۔

اویس: ٹھیک ہے۔

(دونوں دوست جماعت کے کمرے کی طرف چل پڑتے ہیں۔)

2 ماں اور بیٹی کے مابین کھانے پینے کے آداب پر مکالمہ

(ماں باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہی ہیں۔ بیٹی کالج سے آتی ہے اور ماں سے ملتی ہے۔ دونوں میں اس طرح گفت گو ہوتی ہے۔)

بیٹی: السلام علیکم، امی جان!

ماں: وعلیکم السلام! آ گئی ہو بیٹی!

بیٹی: جی، امی جان۔ مجھے جلدی سے کھانا دے دیں، بہت بھوک لگی ہے۔

ماں: بس تھوڑا صبر کرو، ابھی کھانا مل جاتا ہے۔

بیٹی: (ایک پلیٹ میں ہاتھ ڈال کر چاول نکالتے ہوئے) یہ کیا ہے؟ اوہ! یہ تو چاول ہیں۔

ماں: کچھ خیال کرو بیٹی، کھانے پینے کی چیزوں میں ایسے ہاتھ نہیں مارتے۔

بیٹی: (چاول کھاتے ہوئے) کیا کروں، بہت بھوک لگی ہے۔

ماں: آج تمھیں اتنی بھوک کیوں لگ گئی ہے؟

بیٹی: صبح کالج سے دیر ہو رہی تھی، اس لیے ناشتہ نہیں کر سکی۔

ماں: چلو میں ابھی کھانا دیتی ہوں۔ تم ہاتھ دھو کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔

بیٹی: بس میں یہیں کھڑی ہو کر کھا لیتی ہوں۔ میرے ہاتھ بھی صاف ہیں۔

ماں: نہیں بیٹی۔ کھانے پینے کے آداب ہیں۔ مہذب لوگ کھانے پینے کے آداب کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

بیٹی: امی جان! کھانے پینے کے کیا آداب ہوتے ہیں؟

ماں: بیٹی! کھانا کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھوں کو اچھی طرح دھونا چاہیے۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھو کر کسی کپڑے یا تولیے سے خشک نہیں کرنے چاہییں۔

بیٹی: کھانے سے پہلے ہاتھوں کو دھونا کیوں ضروری ہے؟

ماں: گندے ہاتھوں پر بہت سے جراثیم ہوتے ہیں۔ یہ جراثیم کھانے کے ساتھ ہمارے پیٹ میں چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم بیماریوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔

بیٹی: یہ بات تو سمجھ آ گئی ہے۔ کھانے کے اور کون سے آداب ہیں امی جان؟

ماں: کھانا ہمیشہ صاف ستھری جگہ پر بیٹھ کر کھانا چاہیے۔ کھانا مسنون دعا "بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ" پڑھ کر دائیں ہاتھ سے کھانا چاہیے۔ اگر کھانا شروع کرتے وقت مسنون دعا "بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ" بھول جائیں تو کھانے کے دوران میں "بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ" پڑھ لینی چاہیے۔

بیٹی: اگر کھانا پسند کا نہ ہو تو کیسے خوش دلی سے کھائیں؟

ماں: اگر کھانا پسند کا نہ ہو تو اس میں نقص نہیں نکالنے چاہییں۔ انسان کو ہر قسم کی سبزی اور دال خوشی سے کھانی چاہییں۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ ہر کھانے کا اپنا ذائقہ ہوتا ہے۔ کسی چیز کو ناپسند نہیں کرنا چاہیے۔

بیٹی: لیکن امی جان! مجھے گوبھی اور پالک بالکل پسند نہیں۔

ماں: بیٹی! اگر ان سبزیوں کا سالن کھاؤ گی تو اچھا لگے گا۔ اگر یہ تمھیں پسند نہیں تو ان سے منھ موڑنا اچھی بات نہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ ان کو ناپسند کر کے ہمیں کفرانِ نعمت نہیں کرنا چاہیے۔

بیٹی: ٹھیک ہے امی جان! آیندہ میں ان سبزیوں کا سالن بھی کھا لیا کروں گی۔

ماں: شاباش بیٹی!

بیٹی: امی جان! کھانے پینے کے اور کیا آداب ہیں؟

ماں: کھانا ہمیشہ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ کھانے میں زیادہ لوگ شامل ہوں تو ان کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ کھانے کے دوران میں گفت گو سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کھانا ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی پلیٹ کو اچھی طرح صاف کرنا چاہیے۔ کھانا کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور مسنون دعا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" پڑھنی چاہیے۔ اس طریقے سے کھانا بابرکت اور اجر و ثواب کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

بیٹی: امی جان! کیا پانی یا چائے وغیرہ پینے کے بھی آداب ہیں؟

ماں: جی ہاں! پانی پینے کے بھی آداب ہیں۔ پانی بھی بیٹھ کر پینا چاہیے۔ بسم اللہ پڑھ کر پینا چاہیے اور برتن بھی صاف ستھرا ہو۔ پانی پیتے ہوئے کم از کم تین بار وقفہ کرنا چاہیے اور پانی پینے کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہنا چاہیے۔ اسی طرح چائے یا کافی پیتے ہوئے جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ زیادہ گرم چائے سے زبان یا منھ جلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہچکی بھی لگ سکتی ہے۔ کھانا کھا کر اونچی آواز میں ڈکار بھی نہیں لینی چاہیے۔

بیٹی: امی جان! آپ نے مجھے اتنی اچھی اور مفید باتیں بتائی ہیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آیندہ میں کھانے پینے کے آداب کا خیال رکھوں گی۔ اب مجھے جلدی سے کھانا دے دیں۔ آپ کو تو پتا ہے چاول مجھے بہت پسند ہیں۔

ماں: مجھے پتا ہے چاول تمھیں پسند ہیں۔ اس لیے میں نے تمھارے لیے چاول پکائے ہیں۔ تم جلدی سے یونی فارم بدل لو اور ہاتھ دھو لو، میں کھانا لاتی ہوں۔

بیٹی: ٹھیک ہے امی جان!

(بیٹی یونی فارم بدل کر ہاتھ دھونے کے لیے چلی جاتی ہے۔)

3 استاد کے ساتھ دو شاگردوں کا متوازن غذا پر مکالمہ

(تفریح کے پیریڈ کے دوران میں ارشین اور عائشہ کی ملاقات اپنی ٹیچر سے ہوتی ہے۔ ٹیچر کے ہاتھ میں متوازن غذا اور غذائی ضروریات کے بارے میں ایک کتاب ہے۔ دونوں شاگردوں اور ٹیچر کے درمیان اس طرح گفت گو ہوتی ہے۔)

ارشین اور عائشہ: السلام علیکم ٹیچر!

ٹیچر: وعلیکم السلام! کیا حال ہے بچو!

ارشین اور عائشہ: ہم ٹھیک ہیں ٹیچر! آپ کیسی ہیں؟

ٹیچر: میں بھی ٹھیک ہوں، کیا کوئی کام ہے مجھ سے؟

ارشین: جی ٹیچر۔

ٹیچر: ہاں، کہو کیا کام ہے؟

ارشین: ہم نے آپ سے ''متوازن غذا'' کے بارے میں پوچھنا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟

ٹیچر: غذا سے مراد ہماری خوراک اور متوازن غذا اس خوراک کو کہتے ہیں جس میں ہمارے جسم کی ضرورت کے تمام اجزا موجود ہوں۔

ارشین: متوازن غذا میں کون سے اجزا شامل ہیں؟

ٹیچر: متوازن غذا میں بنیادی طور پر چھے اجزا کا ہونا ضروری ہے۔ ان چھے اجزا میں کاربوہائیڈریٹس، پروٹین، چربی، وٹامنز، نمکیات اور پانی شامل ہیں۔

ارشین: ہمارے جسم کو ان اجزا کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟

ٹیچر: ہمیں زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن زندگی اور اچھی صحت کے لیے ان تمام اجزا کی مناسب مقدار انتہائی ضروری ہوتی ہے۔

عائشہ: ٹیچر! یہ تمام ضروری اجزا کن غذاؤں سے حاصل ہوتے ہیں؟

ٹیچر: گوشت، انڈے، دودھ، دالیں، پنیر، خشک میوہ جات اور قدرتی غذاؤں سے ہمیں ان تمام اجزا کی مناسب مقدار حاصل ہوتی ہے۔

ارشین: آپ نے ابھی قدرتی غذا کا ذکر کیا ہے۔ یہ قدرتی غذائیں کون سی ہیں؟

ٹیچر: وہ غذائیں جن کو ہم بغیر پکائے استعمال کرتے ہیں۔ یہ قدرتی غذائیں کہلاتی ہیں۔ دودھ، مکھن، پنیر، خشک میوہ جات اور پھل قدرتی غذاؤں میں شامل ہیں۔ اسی طرح وہ تازہ سبزیاں جنھیں ہم پکائے بغیر کچی استعمال کر سکتے ہیں، وہ بھی قدرتی غذا میں شامل ہیں۔

عائشہ: ٹیچر! ہم ان غذاؤں سے بھرپور غذائی اجزا کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

ٹیچر: بہت اچھا سوال کیا آپ نے۔ غذائی اجزا حاصل کرنے کے لیے ہمیں ایسی خوراک چاہیے جو زیادہ نہ پکائی گئی ہو۔ خوراک کو ایسے پکانا چاہیے کہ اس کے غذائی اجزا محفوظ رہیں۔ زیادہ پکانے سے خوراک کے غذائی اجزا ضائع ہو جاتے ہیں۔ ایسی خوراک کھانے سے ہمیں فائدے کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔

ارشین: ایسی خوراک کھانے سے ہمیں کیا نقصان ہوتا ہے؟

ٹیچر: ایسی خوراک ہمارے جسم کے نظامِ انہضام کو خراب کر دیتی ہے۔ جس سے ہمارے پیٹ میں درد اور بدہضمی کی شکایت ہو سکتی ہے۔

عائشہ: ٹیچر! بدہضمی صرف زیادہ پکی ہوئی خوراک کھانے سے ہوتی ہے؟

ٹیچر: نہیں۔ بدہضمی کی یہ ایک وجہ ہے۔ بدہضمی کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ زیادہ کھانے یا مضرِ صحت کھانے سے بھی ہمارا نظامِ انہضام خراب ہو جاتا ہے۔ اگر گوشت، سبزی اور پھل وغیرہ اچھی طرح صاف کر کے استعمال نہ کیے جائیں تو بیماری کا سبب بن سکتے ہیں۔

ارشین: ٹیچر! جن غذاؤں میں یہ اجزا شامل نہ ہوں، انھیں کیا کہتے ہیں؟

ٹیچر: وہ غذائیں جن کے غذائی اجزا محفوظ نہ ہوں یا جن میں اچھی غذائی صلاحیت موجود نہ ہو، انھیں غیر متوازن یا نامکمل غذا کہتے ہیں۔ ایسی غذا صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔

عائشہ: ٹیچر! کھانے کی چیزوں کے بارے میں تو آپ نے بتا دیا۔ کچھ پینے کے بارے میں بتائیں۔

ٹیچر: پینے کے حوالے سے ہمارے جسم کے لیے سب سے اہم اور ضروری چیز پانی ہے۔ پانی ہماری خوراک اور جسم کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ دودھ اور تازہ پھلوں کا جوس بھی ہماری صحت کے لیے ضروری ہے۔

ارشین: کیا پانی پینے کے معاملے میں بھی کوئی احتیاط ضروری ہے؟

ٹیچر: جی ہاں! پینے کا پانی صاف اور شفاف ہونا چاہیے۔ زیادہ ٹھنڈا یا زیادہ گرم پانی نقصان دہ ہے۔ اس سے نزلہ، زکام بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ گلا اور ہاضمہ خراب ہونے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ ایک ہی مرتبہ بہت زیادہ پانی نہیں پینا چاہیے۔ پانی کا استعمال زیادہ کرنا چاہیے لیکن وقفہ وقفہ سے تھوڑا تھوڑا پانی پیتے رہنا چاہیے۔

ارشین: ٹیچر! متوازن غذا کی غذائی صلاحیت کو خراب کرنے والے عوامل کون سے ہیں؟

ٹیچر: متوازن غذا سے بھرپور فائدہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اجزا کو زیادہ پکا کر خراب نہ کیا جائے۔ زیادہ پکانے اور مرچ مسالوں کے زیادہ استعمال سے غذائی اجزا متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں پھل، سبزیاں، دودھ اور گوشت وغیرہ تازہ استعمال کرنے چاہییں۔ اس کے علاوہ متوازن غذا کا اعتدال کے ساتھ استعمال ہی مفید ہے۔

عائشہ: ٹیچر! متوازن غذا کے اعتدال کے ساتھ استعمال سے کیا مراد ہے؟

ٹیچر: اس کا مطلب ہے کہ کھانا اسی وقت کھایا جائے، جب بھوک ہو۔ کھانا وقت پر اور ضرورت کے مطابق کھانا چاہیے۔ متوازن غذا بھی اگر ضرورت سے زیادہ کھائی جائے تو وہ نقصان دیتی ہے۔ زیادہ کھانا مختلف بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔

ارشین: ٹیچر! متوازن غذا سے بھرپور فائدہ لینے کے لیے اور کیا کرنا چاہیے؟

ٹیچر: متوازن غذا ہمارے جسم کی غذائی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ متوازن غذا میں موجود غذائی اجزا کو اچھی طرح ہضم کرنے اور جسم کا حصہ بنانے کے لیے ورزش اور چہل قدمی بھی ضروری ہے۔ اس لیے زیادہ کھانے اور سستی سے بچنا چاہیے۔

عائشہ: ٹیچر! آپ نے ہمیں متوازن غذا کے بارے میں اتنی اہم اور مفید معلومات دیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔

ٹیچر: بچو! مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ میں سیکھنے اور جاننے کا شوق ہے۔ صرف معلومات حاصل کرنا ہی کافی نہیں۔ اچھی چیزیں جان کر ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

ارشین: جی ٹیچر! ہمیں اب متوازن غذا کے فائدے معلوم ہو گئے ہیں۔ ہم بھی اب متوازن غذا استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے علاوہ ہم کھانے پینے میں بھی اعتدال کریں گے۔

ٹیچر: شاباش بچو! اب آپ جماعت کے کمرے میں چلیں۔

ارشین اور عائشہ: جی بہتر ٹیچر! آپ کا بہت شکریہ۔

(دونوں شاگرد جماعت کے کمرے کی طرف چلی جاتی ہیں۔)

4 ایک کسان کا صنعت کار سے مکالمہ

(حمزہ شوگر ملز کے باہر گنے سے لدی ٹرالیوں کی ایک لمبی قطار ہے۔ ایک کسان مل میں صنعت کار کے دفتر میں اس سے ملاقات کرتا ہے۔)

کسان: (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) السلام علیکم! جناب میں اندر آ سکتا ہوں؟

صنعت کار: وعلیکم السلام! جی، آ جاؤ۔ کیسے آنا ہوا؟

کسان: جی میں گنے کی ٹرالی لے کر آیا ہوں۔

صنعت کار: (بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے) بیٹھو، کیا کام ہے؟

کسان: (بیٹھتے ہوئے) شکریہ جناب۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں گنے کی ایک ٹرالی لے کر آیا ہوں۔ کل سے میری ٹرالی قطار میں کھڑی ہے۔

صنعت کار: تو میں کیا کر سکتا ہوں؟

کسان: جناب آپ مالک ہیں۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں؟

صنعت کار: دیکھیں۔ ہر ٹرالی اپنے نمبر پر اندر آتی ہے اور گنا تول کرا تارا جاتا ہے۔ یہ سسٹم ایسے ہی چلتا ہے۔

کسان: لیکن جناب! اس سسٹم سے ہم غریب کسانوں کا بہت نقصان ہوتا ہے۔ اس کو بہتر کریں۔

صنعت کار: اس سے آپ کا کیا نقصان ہوتا ہے؟

کسان: ہمارا بہت سا وقت شوگر مل کے باہر ٹرالی کے ساتھ ضائع ہوتا ہے۔ یہ موسم گنے کی کٹائی کا بھی ہے اور ساتھ گندم کی کاشت کا بھی۔ ہم گنے کی فصل کاٹ کر وہاں گندم کاشت کرتے ہیں۔ گندم کی کاشت کا وقت بہت محدود ہوتا ہے۔ ہمارا بہت سا وقت گنا اُتروانے میں صرف ہو جاتا ہے، اس لیے کھیتوں میں گنے کی کٹائی اور گندم کی کاشت میں دیر ہو جاتی ہے۔

صنعت کار: چلیں پھر بھی آپ گندم کاشت تو کر لیتے ہیں نا؟

کسان: جی، گندم کاشت تو کر لیتے ہیں، لیکن دیر سے کاشت کی گئی گندم کی پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔ اس طرح ہمیں دُہرا نقصان ہوتا ہے۔

صنعت کار: دُہرا نقصان کیسے ہوتا ہے؟

کسان: ہمارا ایک آدمی تین دن تک گنے کی ٹرالی کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ گنے کی کٹائی کا کام بھی بہت متاثر ہوتا ہے۔ دیر سے بوئی گئی گندم کی پیداوار کم ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ اس کے علاوہ جو گنا ہم شوگر مل کو بیچتے ہیں، اس کی قیمت بہت دیر سے ملتی ہے۔ شوگر مل والے گنے کی قیمت بھی کم دیتے ہیں۔

صنعت کار: ہم لوگ گنے کی قیمت کم نہیں دیتے۔ گنے کی قیمت حکومت طے کرتی ہے۔ اس لیے حکومت جو قیمت طے کرتی ہے، ہم کسانوں کو اس سے کم نہیں دیتے۔ جہاں تک گنے کی رقم کی بات ہے، ہم تو کسانوں کو رقم جلدی ادا کر دیتے ہیں۔ ہماری مل کی طرف سے ہر ہفتے رقم کسانوں کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ پچھلے دو سال سے ہم گنے کی رقم ایک ماہ کے اندر اندر ادا کر رہے ہیں۔

کسان: غریب کسانوں کے لیے ایک ماہ کا وقت بھی بہت زیادہ ہے۔ ہمارے اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمیں فصلوں کی کاشت کے لیے نقد رقم کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

صنعت کار: فصل کی کاشت کے لیے آپ کو رقم کی زیادہ ضرورت کیوں ہوتی ہے؟

کسان: جناب آپ کو کیا پتا! کاشت کاروں کے لیے فصلیں کاشت کرنا کتنا مشکل کام بن گیا ہے۔ بیج اور کھاد کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ نہری پانی نہیں ملتا اور ٹیوب ویل کے ذریعے فصل کو پانی دینا پڑتا ہے۔ ڈیزل، کھاد، بیج اور سپرے وغیرہ کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے فصل کاشت کرنے کے لیے بہت رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔

صنعت کار: لیکن گنے کی کاشت کے لیے تو بہت زیادہ رقم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کسان: نہیں، ایسی بات نہیں۔ گنے کی فصل کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی حفاظت، کٹائی، ٹرالی پر لادنا اور شوگر مل تک پہنچانا کافی مشکل کام ہے۔ ان سب کاموں پر بھی بہت خرچہ ہوتا ہے۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ گنے کی قیمت ہمیں کم ملتی ہے۔ آپ لوگوں کو کیا پتہ غریب کسانوں کو کن مشکلات کا سامنا ہے۔ آپ صنعت کار ہیں، آپ کے پاس دولت کی ریل پیل ہوتی ہے، اسی لیے آپ کو ہماری پریشانیوں کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

صنعت کار: نہیں، ایسی بات نہیں ہے کہ صنعت کار یا فیکٹریوں کے مالکوں کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہمارے بھی بے شمار مسائل ہیں۔ فیکٹریاں لگانا اور چلانا کوئی آسان کام نہیں۔ مشینوں سے کام لینا بھی روپے کے بغیر ممکن نہیں۔ مل میں بہت سے لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا، ان کو تنخواہ دینا، بجلی کے بل، مشینوں کی مرمت کے اخراجات وغیرہ کے لیے بھی بہت سا سرمایہ چاہیے۔ اس کے علاوہ بہت سے حکومتی معاملات اور ٹیکس وغیرہ کے مسائل بھی حل کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ یہ نہ سمجھیں کہ صنعت کاروں کو مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

کسان: آپ کی بات ٹھیک ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ کسانوں کو وقت پر رقم دیں اور ان کو سہولت دیں تا کہ وہ خوشی سے فصلیں کاشت کریں۔ مل کو خام مال تو کسان ہی مہیا کرتے ہیں۔ اس لیے کسانوں اور صنعت کاروں کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیے۔

صنعت کار: میں مانتا ہوں کہ کئی شوگر ملیں، کسانوں کو گنے کی رقم کی ادائی دیر سے کرتی ہیں۔ لیکن میں نے تو آپ لوگوں سے ہمیشہ تعاون کیا ہے۔ کبھی کسی کسان کو گنا تولنے کی شکایت نہیں ہونے دی۔ اس کے علاوہ رقم ادا کرنے میں بھی دیر نہیں کی۔ میں نے تو گنے کو نقد آور فصل بنا دیا ہے۔

کسان: لیکن جناب! آج کل ہمیں جس مسئلے کا سامنا ہے، اس کا بھی کوئی حل نکالیں۔ ہمارا بہت سا وقت ٹرالیوں کی قطار میں ضائع

ہو جاتا ہے۔

صنعت کار: ٹھیک ہے۔ آپ کے اس مسئلے کا بھی کوئی حل نکالتے ہیں۔ میں آج ہی اپنے منیجرز اور متعلقہ عملے سے بات کرتا ہوں۔ ہم ہر طرح سے کسانوں کو سہولت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

کسان: بعض اوقات ہمیں پرمٹ لینے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔ اس کا بھی حل نکالیں۔

صنعت کار: آپ نے اچھا کیا کہ اپنے مسائل سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ آپ کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بے فکری سے فصلیں کاشت کریں تا کہ ہمارا ملک خوش حال ہو۔

کسان: بہت شکریہ جی، آپ نے میری بات سنی۔

صنعت کار: کوئی بات نہیں۔ کوئی اور مسئلہ بھی ہو تو بتا دو۔

کسان: نہیں جی، جو مسئلے آپ کو بتائے ہیں، ان کو جلدی حل کروا دیں۔ ہم بہت پریشان ہیں۔

صنعت کار: ضرور۔ میں آج ہی متعلقہ عملے سے بات کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

کسان: (اُٹھتے ہوئے) بہت شکریہ جی۔ اللہ حافظ!

صنعت کار: اللہ حافظ!

(کسان صنعت کار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دفتر سے باہر چلا جاتا ہے۔)

5 باپ کا بیٹے کے داخلے کے لیے پرنسپل سے مکالمہ

(کالج میں گیارھویں جماعت میں داخلے ہو رہے ہیں۔ ایک والد اپنے بچے کے داخلے کے لیے کالج آتا ہے اور پرنسپل سے یوں گفت گو ہوتی ہے۔)

باپ: (دفتر میں داخل ہوتے ہوئے) السلام علیکم جناب! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟

پرنسپل: وعلیکم السلام۔ آ جائیں۔

باپ: جناب میں اپنے بیٹے کے سال اول میں داخلے کے لیے آیا ہوں۔

پرنسپل: جی، آپ تشریف رکھیں۔

باپ: (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) شکریہ جناب۔

پرنسپل: جی بتائیں، آپ کے بیٹے نے کس شعبے میں داخلہ لینا ہے؟

باپ: جناب ہم اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں۔

پرنسپل: اس کا مطلب ہے آپ اسے پری میڈیکل میں داخلہ دلانا چاہتے ہیں۔

باپ: جی جناب، ایسا ہی ہے۔

پرنسپل: میٹرک میں کتنے نمبرز ہیں آپ کے بیٹے کے؟

باپ: میٹرک میں اس کے 1024 نمبرز ہیں۔

پرنسپل: نمبر تو ٹھیک ہیں۔ آپ کے بیٹے کا داخلہ ہو جائے گا۔ آپ کلرک سے پراسپیکٹس اور فائل لے لیں۔

باپ: جی جناب، داخلہ تو ہو جائے گا لیکن ایک مسئلہ ہے۔

پرنسپل: وہ کیا؟ فرمائیں آپ۔

باپ: میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میرے دو ہی بچے ہیں۔ ایک بیٹی میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کا دوسرا سال ہے۔ میں اپنے بیٹے کو بھی ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں، لیکن میرے مالی وسائل بہت کم ہیں۔

پرنسپل: آپ غریب ہونے کے باوجود اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلا رہے ہیں اور اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنا رہے ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کرتے کیا ہیں؟

باپ: میں بلدیہ میں کلرک ہوں۔ کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔ اکیلا کمانے والا ہوں، اس لیے اخراجات پورے کرنا مشکل ہیں۔

پرنسپل: تو پھر بچوں کو کیسے تعلیم دلا رہے ہیں؟

باپ: میرے بچے بہت ذہین اور محنتی ہیں۔ میری بچی کا میرٹ پر میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا ہے۔ اس نے ایف۔ ایس۔ سی میں دوسری پوزیشن لی تھی۔ اس لیے اس کی میڈیکل کی تعلیم مفت ہے اور اسے وظیفہ بھی ملتا ہے۔

پرنسپل: آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے بیٹے کے نمبر بھی بہت اچھے ہیں۔ اگر وہ ایف۔ ایس۔ سی میں بھی محنت کرے گا تو ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

باپ: میرا بیٹا بہت محنتی ہے۔ وہ ایف۔ ایس۔ سی میں بھی ضرور محنت کرے گا اور ان شاء اللہ، بہت اچھے نمبر لے کر آپ کے کالج کا نام روشن کرے گا۔

پرنسپل: ہمارے کالج میں پڑھائی بہت اچھی ہوتی ہے۔ طالب علموں کو ٹیوشن پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارے کالج کے تمام پروفیسر بہت محنتی اور تجربہ کار ہیں۔ وہ محنتی بچوں پر خاص توجہ دیتے اور ان کی پڑھائی میں ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔

باپ: جی جناب! میں نے اس کالج کی پڑھائی اور ڈسپلن کی بہت تعریف سنی ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں میرا بیٹا بھی یہیں تعلیم حاصل کرے۔

پرنسپل: میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اتنے ذہین بچے کی تعلیم کے لیے ہمارے کالج کا انتخاب کیا۔

باپ: جناب! یہاں بچے کی تعلیم کے اخراجات کتنے ہوں گے؟

پرنسپل: بچے کی تعلیم کے اخراجات کی فکر نہ کریں۔ آپ کے بیٹے کا داخلہ ہو جائے تو میں اس کی ٹیوشن فیس اور دوسرے فنڈز معاف کر دوں گا۔

باپ: بہت شکریہ جناب۔ لیکن یونی فارم، کتابوں، کاپیوں وغیرہ کا بھی تو کافی خرچ ہوگا۔

پرنسپل: جی ہاں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے بچے کو حکومت کی طرف سے بھی وظیفہ ملے گا اور اگر ضرورت پڑی تو کالج کے بہبود فنڈ سے بھی آپ کی مالی مدد ہو جائے گی۔

باپ: یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ نے میری پریشانی ختم کر دی۔ آپ کا بہت شکریہ۔

پرنسپل: بیٹے کے تعلیمی اخراجات کے بارے میں آپ پریشان نہ ہوں۔ بس آپ کلرک سے فائل لے لیں اور بچے کا داخلہ کروا دیں۔

باپ: (اٹھتے ہوئے) جی بہتر جناب۔ بہت شکریہ۔

پرنسپل: مزید رہنمائی کے لیے کلرک موجود ہے۔ کبھی میری ضرورت ہوئی تو آپ مجھ سے مل سکتے ہیں۔

باپ: ٹھیک ہے۔ میں آج ہی بچے کا داخلہ کروا دیتا ہوں۔ خدا حافظ!

پرنسپل: خدا حافظ!

(باپ دفتر سے نکل کر کلرک کے دفتر کی طرف چلا جاتا ہے۔)

6 الیکشن کے امیدوار اور ووٹر کے درمیان مکالمہ

(بہاول پور بورڈ 2023)

(الیکشن قریب ہیں اور صوبائی اسمبلی کا ایک امیدوار گھر گھر جا کر لوگوں سے ووٹ مانگتا ہے۔ ایک گھر میں ایک بزرگ ووٹر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور گفت گو کا سلسلہ یوں چلتا ہے۔)

امیدوار: السلام علیکم! بزرگ وار، کیسے ہیں آپ؟

ووٹر: (غور سے دیکھتے ہوئے) وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔ آپ کہیے، کیسے آنا ہوا؟

امیدوار: لگتا ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں راؤ فریاد احمد صوبائی اسمبلی کے لیے امیدوار ہوں۔

ووٹر: جی، میں نے پہچان لیا ہے آپ کو۔ یقیناً آپ ووٹ مانگنے ہی آئے ہوں گے۔

امیدوار: (کھسیانا سا ہو کر) جی، جی جناب۔ ایسا ہی ہے۔

ووٹر: آپ کی مہربانی ہے کہ آپ الیکشن کے دنوں میں تو حلقے میں نظر آئے۔ پچھلی مرتبہ بھی الیکشن کے دنوں میں ہی آپ کو حلقے میں دیکھا تھا۔

امیدوار: (شرمندہ سا ہو کر) ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل پچھلی مرتبہ ہماری پارٹی اپوزیشن میں تھی اور ہم اپنی پارٹی کو منظم کرنے اور مضبوط کرنے میں لگے رہے، اس لیے حلقے میں آنا ذرا کم ہو گیا ہے۔

اس بار بھی آپ الیکشن جیت کر حلقے والوں کو بھول جائیں گے۔

ووٹر:

امیدوار: نہیں جناب، ایسا نہیں ہوگا۔ اب ہماری پارٹی کی پوزیشن کافی بہتر ہے۔ امید ہے اس دفعہ حکومت ہماری پارٹی کی ہی بنے گی۔ پھر اپنے حلقے کے مسائل حل کروانے کے لیے میں زیادہ وقت ادھر ہی رہوں گا۔

ووٹر: آپ کو اپنے حلقے کے مسائل کا کچھ پتا بھی ہے؟

امیدوار: جی ہاں، میں لوگوں سے ملا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ لوگوں کے بے شمار مسائل ہیں۔ بہت سے ترقیاتی کام ہونے والے ہیں۔ آپ یقین کریں میں کامیاب ہو کر ان شاء اللہ، سارے مسائل حل کرا دوں گا۔ آپ باشعور بزرگ ہیں۔ آپ حکم کریں کہ حلقے میں کون سے ضروری کام ہیں؟

ووٹر: ویسے تو بہت سے کام ہیں، جو ضروری ہیں، لیکن میری نظر میں ووکیشنل ٹریننگ اور سپیشل ایجوکیشن سکول کی اشد ضرورت ہے۔

امیدوار: آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔ یہ واقعی بہت ضروری ہیں۔ اگر آپ مجھے ووٹ دے کر کامیاب کرائیں گے تو میں ضرور اپنے علاقے کی خدمت کروں گا۔

ووٹر: ووٹ لینے کے لیے سب امیدوار ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔

امیدوار: آپ کی یہ بات بھی درست ہے۔ ہر امیدوار چاہتا ہے کہ لوگ اسے ووٹ دیں، لیکن آپ لوگوں نے فیصلہ کرنا ہے کہ آپ کے ووٹ کا صحیح حق دار کون ہے؟

ووٹر: اچھا چلیں آپ بتائیں کہ ہم آپ کو ووٹ کیوں دیں اور آپ کے مخالف امیدوار کو ووٹ کیوں نہ دیں؟

امیدوار: آپ جانتے ہیں کہ میرا مخالف امیدوار اس حلقے کا رہنے والا نہیں ہے۔ اسے پارلیمانی جمہوریت کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ جب کہ میں اس حلقے کا مستقل رہائشی ہوں۔ میں نے اس حلقے میں بہت سے بڑے بڑے کام کروائے ہیں، اس لیے اگر آپ علاقے کی ترقی چاہتے ہیں تو اپنا قیمتی ووٹ مجھے دیں۔

ووٹر: اپنے مخالف امیدوار کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ووٹ کا اہل نہیں، لیکن لوگ پارٹیوں کے منشور اور امیدواروں کی اہلیت بھی دیکھتے ہیں۔ لوگ نظریاتی لحاظ سے بھی امیدواروں کا جائزہ لے کر ووٹ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

امیدوار: پھر تو یقیناً آپ ہماری پارٹی کے منشور سے بھی آگاہ ہوں گے؟ آپ جانتے ہیں کہ گزشتہ الیکشن میں ہماری پارٹی کو اکثریت نہیں ملی تھی۔ اس لیے ہم اپوزیشن میں بیٹھے تھے۔ ہماری پارٹی نے کبھی اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا۔ ہماری پارٹی نے ماضی میں بھی ملک و قوم کی خدمت کی ہے۔ اب بھی کامیاب ہو کر ہم ان شاء اللہ، اپنے منشور کو ضرور پورا کریں گے۔

ووٹر: آپ کے بارے میں ہم جانتے ہیں اور آپ کی پارٹی سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ کی پارٹی نے کسی حد تک قوم سے کیے گئے وعدے پورے کیے ہیں۔ اس لیے ہمیں آپ پر اعتماد ہے۔

امیدوار: ہماری پارٹی ایک نظریاتی پارٹی ہے، قوم کی خدمت اور ملک کی ترقی ہمارا بنیادی مقصد ہے۔ آپ ہم پر بھروسہ رکھیں۔ ہماری حکومت بن جائے تو ملک کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

ووٹر: ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک ترقی کرے۔

امیدوار: آپ تسلی رکھیں۔ ہماری پارٹی کا منشور بھی بہت اچھا ہے اور ہمارے پاس اس منشور پر عمل کروانے والے لوگ بھی بہت باصلاحیت ہیں۔ ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔

ووٹر: ہمیں آپ کی پارٹی پر بھی اعتماد ہے اور آپ پر بھی۔ اس لیے ہم ووٹ آپ کو ہی دیں گے مگر۔۔۔

امیدوار: جی جی، آپ فرمائیے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

ووٹر: میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کامیاب ہو کر آپ عوام اور اپنے حلقے کے لوگوں کو بھلا نہ دینا۔

امیدوار: نہیں جناب، میں منتخب ہونے کے بعد اپنے حلقے کے عوام سے ضرور رابطے میں رہوں گا اور اپنے حلقے کے لوگوں کی خدمت کروں گا کیوں کہ حضور اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے کہ: "لوگوں میں بہترین وہ ہے جو دوسروں کے لیے زیادہ نفع مند ہو۔" (ابو داؤد و ترمذی)

ووٹر: ہمیں آپ سے یہی توقع ہے۔

امیدوار: میں ہمیشہ آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔
ووٹر: آپ کی باتیں سن کر خوشی ہوئی۔ ہم ووٹ آپ ہی کو دیں گے۔
امیدوار: (مصافحہ کرتے ہوئے) آپ کا بہت شکریہ۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ ووٹ دیتے ہوئے اپنی ذات یا تعلق کو نہیں بلکہ ملک و قوم کی بہتری کا سوچتے ہیں۔ آپ جیسے نظریاتی ووٹر ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔
ووٹر: ہم بھی آپ جیسے نظریاتی سیاست دانوں کی قدر کرتے ہیں۔
امیدوار: بہت شکریہ جناب۔ اب آپ مجھے اجازت دیں۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔ میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔
ووٹر: اللہ حافظ! اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے۔
(امیدوار، ووٹر سے رُخصت ہو کر اگلی گلی کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

7 دو سہیلیوں کے درمیان کمپیوٹر، انٹرنیٹ کے مثبت اور منفی استعمال پر مکالمہ

(عائکہ اپنی سہیلی کلثوم رانی سے ملنے اس کے گھر آئی۔ کلثوم رانی کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہی ہوتی ہے۔ دونوں سہیلیوں میں اس طرح گفتگو ہوتی ہے۔)

عائکہ: السلام علیکم! کلثوم کیسی ہو؟
کلثوم: وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔ اتنے دنوں بعد کیسے آنا ہوا؟
عائکہ: میرے کمپیوٹر کا مانیٹر خراب ہو گیا ہے۔ کل کے لیے ایک پریزینٹیشن (Presentation) تیار کرنی تھی، اس لیے تمھارے پاس چلی آئی ہوں۔
کلثوم: اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میں نے بھی کمپیوٹر کی کچھ چیزوں کے بارے میں بات کرنی تھی۔
عائکہ: پہلے مجھے کمپیوٹر پر کام کرنے دو۔
کلثوم: (عائکہ کے لیے کرسی چھوڑتے ہوئے) آؤ بیٹھو۔ تم کام کرو اور میں تمھارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔
عائکہ: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) شکریہ۔ میں اپنے نوٹس بھی لائی ہوں۔ بس میرا تھوڑا سا کام ہے۔ میں ابھی مکمل کر لیتی ہوں۔ (کلثوم چائے لینے جاتی ہے اور عائکہ کام میں مگن ہو جاتی ہے۔)
کلثوم: یہ لو، میں چائے اور گرما گرم پکوڑے لے کر آئی ہوں۔
عائکہ: واہ! یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ میں نے بھی اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔
کلثوم: دیکھو! کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہمارے لیے کتنے فائدہ مند ہیں۔
عائکہ: بالکل! انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی وجہ سے دنیا گلوبل ویلیج میں تبدیل ہو گئی ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں موجود شخص سے ہم آڈیو یا ویڈیو کال کے ذریعے رابطہ کر سکتے ہیں۔
کلثوم: موجودہ دور کی یہ بہترین سائنسی ایجاد ہے۔ عملی زندگی میں اس کے بہت فائدے ہیں۔
عائکہ: جی ہاں! کمپیوٹر اور انٹرنیٹ انسان کے لیے ایک مفید ایجاد ہے۔
کلثوم: طالب علم اپنی پڑھائی میں اس سے بہت مدد لے سکتے ہیں۔ کسی بھی موضوع پر رہنمائی درکار ہو تو انٹرنیٹ کے ذریعے ہر جگہ رہنمائی لی جا سکتی ہے۔
عائکہ: آج کل "Chat GPT" اور آرٹیفیشل انٹیلیجنس (AI) کے ذریعے بھی بہت سے مفید کام لیے جا رہے ہیں۔
کلثوم: انٹرنیٹ طلبہ کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کے ذریعے طلبہ کو علم حاصل کرنے میں بہت سہولت ہے۔ ہر مضمون پر بہترین لیکچرز سُن اور دیکھ کر چیزوں کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔
عائکہ: اس کے علاوہ ہر قسم کے علمی اور سائنسی مضامین کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔
کلثوم: انٹرنیٹ نے بے روزگاری کے مسائل کو بھی حل کرنے میں مدد دی ہے۔ آن لائن بنکنگ اور E-Commerce کے ذریعے ہم گھر بیٹھے کما سکتے ہیں۔

عائکہ: تجارت کے ساتھ ساتھ میڈیکل کے شعبے نے بھی انٹرنیٹ کی بدولت نمایاں ترقی کی ہے اور زندگیاں بچانے میں مدد کر رہا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تفریح کے لیے بھی یہ بہت کارآمد ایجاد ہے۔
کلثوم: یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ہماری زندگیوں کو آسان بنا دیا ہے، لیکن اس کے نقصانات بھی تو ہیں۔
عائکہ: تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن نقصان کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ اس میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا کوئی قصور نہیں۔
کلثوم: ہر چیز کے فوائد کے ساتھ ساتھ نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ اگر اعتدال اور سمجھداری سے استعمال کیا جائے تو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے نقصانات سے بچا جا سکتا ہے۔
عائکہ: اگر ہم کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کو صرف تفریح کے لیے استعمال کریں گے تو ہم اس ایجاد سے صحیح فائدہ نہیں لے سکتے۔
کلثوم: انٹرنیٹ پر ہر قسم کا مواد موجود ہے۔ تعلیمی رہنمائی کا مواد بھی ہے اور فضول اور اخلاقیات کو تباہ کرنے والی چیزیں بھی موجود ہیں۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم فضول اور بے ہودہ مواد کے قریب بھی نہ جائیں۔
عائکہ: بے ہودہ اور فضول مواد کی وجہ سے لوگوں کے ذہن گمراہ اور اخلاق تباہ ہو سکتے ہیں۔
کلثوم: اسی طرح ہر وقت کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال سے صحت کے مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔
عائکہ: وہ کیا؟
کلثوم: کمپیوٹر سکرین کے زیادہ استعمال سے سکرین سکنیس (Screen Sickness) ہو جاتی ہے جس سے آنکھوں کی تھکاوٹ اور آنکھوں میں خشکی کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح زیادہ دیر تک کمپیوٹر استعمال کرنے سے نیند کے مسائل اور ڈپریشن کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔
عائکہ: اس کا مطلب ہے زیادہ دیر تک کمپیوٹر سکرین کو مسلسل استعمال نہ کیا جائے۔
کلثوم: جی ہاں! اس کے علاوہ زیادہ دیر تک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے رہنے سے موٹاپے اور دل کے امراض کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ پھر تو زیادہ دیر بیٹھے رہنے سے کمر درد اور پٹھوں کی کمزوری جیسے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔
عائکہ: جی ہاں! صحت کے علاوہ انسان کو معاشی طور پر بھی نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔ طرح طرح کے فراڈ (Spam) اور ہیکنگ (Hacking) کے ذریعے لوگوں کے ذاتی کوائف اور بنک اکاؤنٹ نمبر وغیرہ چوری ہو سکتے ہیں۔
کلثوم: تو پھر ان نقصانات سے کیسے بچا جائے؟
عائکہ: ان مسائل سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ کمپیوٹر کا مثبت اور اعتدال کے ساتھ استعمال کیا جائے۔
کلثوم: اس کا مطلب ہے: Excess of anything is Poison یعنی کسی بھی چیز کی زیادتی زہر ہے۔
عائکہ: بالکل درست کہا تم نے۔ ہم اندھا دھند کمپیوٹر اور انٹرنیٹ استعمال کریں گے تو یقیناً نقصان ہوگا۔ اس لیے ہمیں اعتدال سے کام لینا چاہیے۔
کلثوم: تم نے بہت مفید باتیں بتائی ہیں۔ ہمیں ان پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔
عائکہ: تمھارا بہت شکریہ کہ تم نے مجھے اپنا کمپیوٹر استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اب میں چلتی ہوں۔
کلثوم: تھوڑی دیر اور بیٹھ جاتی تو اچھا تھا۔ ہم کچھ اور گپ شپ کر لیتے۔
عائکہ: نہیں۔ مجھے جلدی جانا ہے۔ مجھے اپنے کمپیوٹر کے مانیٹر کی مرمت کے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔ اس کے بغیر میری پڑھائی نہیں ہو سکتی۔
کلثوم: چلیں ٹھیک ہے۔ جب فرصت ملے آ جایا کرو۔ تمھارے ساتھ گفت گو کر کے مزا آتا ہے۔
عائکہ: بہت شکریہ۔ میں بہت جلد پھر آؤں گی۔ (کلثوم اسے دروازے تک چھوڑنے آتی ہے۔)
کلثوم: خُدا حافظ!
عائکہ: خُدا حافظ!
(عائکہ اپنی سہیلی کلثوم سے اجازت لے کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔)

8 دو دوستوں کے درمیان سگریٹ نوشی کے مضر اثرات پر مکالمہ

(راولپنڈی بورڈ 2023ء)

(حارث اور ثاقب پارک میں ایک بنچ پر بیٹھے ہیں۔ قریب بیٹھا ایک شخص سگریٹ سلگاتا ہے۔ حارث بے زاری کا اظہار کرتا ہے اور اُس سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے۔)

حارث: ہیلو بھائی جان! مہربانی کر کے یہاں سگریٹ نہ سلگائیں۔

سگریٹ نوش: کیوں جناب! آپ کے روپے خرچ ہوئے ہیں؟

حارث: نہیں، روپے تو خرچ نہیں ہوئے۔

سگریٹ نوش: تو پھر کیا تکلیف ہے آپ کو؟

حارث: سگریٹ کے دھوئیں سے مجھے سخت اُلجھن ہوتی ہے اور میرا جی متلاتا ہے۔

سگریٹ نوش: (اُٹھ کر جاتے ہوئے) لیکن میں تو اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حارث: یار ثاقب! ہمارے معاشرے میں سگریٹ نوشی کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

ثاقب: ایسا ہی ہے۔ اب تو نوجوان بھی سگریٹ نوشی کی عادت کا شکار ہو رہے ہیں۔

حارث: سگریٹ نوشی انسانی صحت کے لیے بہت خطرناک ہے، پھر بھی لوگ پتا نہیں کیوں اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ثاقب: سگریٹ میں نیکوٹین ہوتا ہے، اس سے دماغ کو وقتی طور پر کچھ سکون ملتا ہے۔ وقتی سکون حاصل کرنے کے لیے لوگ سگریٹ پینا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی سے وہ سگریٹ کی عادت اور نشے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حارث: سگریٹ میں موجود نیکوٹین بہت خطرناک ہوتا ہے، اس سے بہت سی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔

ثاقب: سگریٹ نوشی سے پھیپھڑوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے اور آدمی کینسر کے مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔

حارث: کینسر کے مرض کے علاوہ سگریٹ نوشی سے گلے، زبان، ہونٹوں اور چھاتی کے بہت سے امراض پیدا ہوتے ہیں۔

ثاقب: یہ امراض بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں اور ان کا علاج بھی بہت مہنگا ہوتا ہے۔

حارث: کتنی بڑی نادانی ہے کہ لوگ سگریٹ نوشی کی وجہ سے اپنی صحت اور پیسا ضائع کرتے ہیں۔

ثاقب: بعض نوجوان شوق سے یا وقت گزاری کے لیے بھی سگریٹ پیتے ہیں۔

حارث: جی ہاں، پھر اسی شوق کے ہاتھوں سگریٹ نوشی کی عادت کا شکار ہو جاتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی صحت و تندرستی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

ثاقب: حارث! ایک تکلیف دہ بات یہ بھی ہے کہ آج کل بعض طلبہ بھی سگریٹ نوشی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حارث: ہاں بھئی! یہ واقعی پریشان کن صورتِ حال ہے۔ اس کا سدِ باب ضرور ہونا چاہیے۔

ثاقب: تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کو چاہیے کہ طلبہ کی سرگرمیوں کی نگرانی کرے اور ان کی اچھی تربیت کرے۔

حارث: اس سلسلے میں والدین کو بھی کردار ادا کرنا چاہیے۔ والدین کو چاہیے کہ اپنے بچوں کی روزانہ کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھیں۔

ثاقب: اگر سگریٹ نوشی کی روک تھام کے لیے مؤثر اقدامات نہ کیے گئے تو معاشرہ بدحالی کا شکار ہو جائے گا۔

حارث: مسئلے کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے حکومت کو خصوص کردار ادا کرنا ہوگا۔ سگریٹ کی ڈبی پر ''خبردار! تمباکو نوشی کینسر اور دل کی بیماریوں کا باعث ہے۔'' لکھ دینا ہی کافی نہیں۔

ثاقب: سگریٹ نوشی کے رُجحان کو کم کرنے کے لیے حکومت کو سگریٹ کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کر دینا چاہیے تاکہ عام لوگ اس کو خرید ہی نہ سکیں۔

حارث: اس کے علاوہ حکومت کو چاہیے کہ تمباکو کی درآمد پر پابندی عائد کر دے۔ میڈیا کو بھی سگریٹ کی تشہیر سے منع کرنا چاہیے۔

ثاقب: میڈیا اور علما کرام کو چاہیے کہ سگریٹ نوشی کے مضر اثرات لوگوں کو بتائیں۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ سگریٹ نوشی کے ذریعے وہ اپنی صحت اور دولت ضائع کرتے ہیں جو کہ دینی لحاظ سے بھی بہت بُرا عمل ہے۔

حارث: صرف حکومت کی سخت پالیسیوں سے فرق نہیں پڑے گا۔ جب تک لوگوں میں احساس اور شعور پیدا نہیں ہوتا، کوئی کوشش اور پالیسی کارگر نہیں ہو سکتی۔

ثاقب: عام لوگوں کو بھی چاہیے کہ اپنا کردار ادا کرتے ہوئے سگریٹ نوشوں کو نصیحت اور انتباہ کرتے رہیں۔

حارث: بالکل درست کہا آپ نے۔ حکومت اور عوام مل کر اس نحوست پر قابو پا سکتے ہیں۔

ثاقب: (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) بہت وقت ہو گیا یہاں بیٹھے ہوئے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔

حارث: ہاں، میں نے ابھی فزکس کا ٹیسٹ یاد کرنا ہے۔ چلتے ہیں۔

ثاقب: ٹھیک ہے۔ آؤ چلیں۔

(دونوں دوست اپنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔)

چند مجوزہ مکالمہ جات

بمطابق اُردو قواعد و انشا

(پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ)

9 دو دوستوں کے درمیان ڈینگی بخار سے حفاظت پر مکالمہ

(عاطف اور ثاقب دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔ عاطف وقفہ کے دوران میں کالج کے صحن میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ ثاقب اس کے پاس آتا ہے اور دونوں میں گفتگو کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے۔)

ثاقب: السلام علیکم!

عاطف: وعلیکم السلام!

ثاقب: آج آپ کا ہم جماعت زوہیب دکھائی نہیں دے رہا۔ کیا وہ چھٹی پر ہے؟

عاطف: جی ہاں! اسے ڈینگی بخار ہو گیا ہے، اس لیے وہ آج غیر حاضر ہے۔

ثاقب: یہ تو بڑی افسوس ناک خبر ہے۔

عاطف: جی ہاں! آج ہمارے ملک خصوصاً پنجاب میں ڈینگی بخار بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے کتنے ہی لوگ زندگی کی بازی ہار چکے ہیں۔

ثاقب: سنا ہے کہ اس بیماری کے علاج کے لیے کوئی ویکسین بھی دریافت نہیں ہوئی۔

عاطف: جی ہاں! یہ حقیقت ہے لیکن بیماری جو بھی ہو اس سے بچاؤ کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہییں۔ ڈینگی بخار سے بچاؤ کے لیے اگر احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں تو اس سے بچاؤ ممکن ہے۔

ثاقب: اس سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر کیا ہیں؟

عاطف: اس سے بچاؤ کی تدابیر آسان ہیں۔ چوں کہ اس بیماری کا سبب بننے والے مچھر پانی پر پرورش پاتے ہیں اس لیے گھر میں اور گھر سے باہر پانی جمع نہیں ہونا چاہیے۔ صفائی کا خیال رکھنا چاہیے اور کھانے پینے کی اشیا کو ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔

ثاقب: اس سے بچاؤ کے لیے مزید کن احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنا چاہیے؟

عاطف: مچھر مار اسپرے کیا جائے، جسے ڈینگی بخار ہوا سے مچھروں سے بچانے کے لیے رات کو سوتے وقت مچھر دانی کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ مچھر بیماری کے جراثیم دوسرے افراد میں منتقل نہ کر سکے۔

ثاقب: ڈینگی کے مریض کو دوائیں کون سی دی جاتی ہیں؟

عاطف: اس بیماری کا کوئی خاص علاج نہیں، آرام کرنے اور پیراسیٹامول کے استعمال سے ہی مریض ایک ہفتے میں صحت یاب ہو جاتا ہے۔

ثاقب: حکومت بھی اس بیماری کی روک تھام کے اقدامات کر رہی ہے اور عوام کو بھی چاہیے کہ بیماری سے بچاؤ کے لیے حفاظتی اقدامات کرے تاکہ لوگ محفوظ رہ سکیں۔

عاطف: ہسپتالوں میں بھی صفائی کا خاص انتظام ہونا چاہیے، کیوں کہ وہاں سے بھی اس کے پھیلنے کا خطرہ ہے۔

ثاقب: یہ مرض سب سے پہلے کہاں سے پھیلا اور اس کے پھیلاؤ کا سبب کون سا مچھر ہے؟

عاطف: یہ مرض سب سے پہلے افریقہ میں پایا گیا اور پھر پورے ایشیا میں پھیلا۔ ایڈیز مچھر اس بیماری کے پھیلاؤ کا ذریعہ ہے۔

ثاقب: سنا ہے کہ یہ مچھر سری لنکا سے درآمد کیے جانے والے ٹائروں کے ذریعے پاکستان میں آئے۔ لیکن ٹائروں میں مچھر کیسے آسکتے ہیں؟

عاطف: ان ٹائروں میں صاف پانی موجود تھا جن میں ان کی پرورش ہوئی۔

ثاقب: کیا آپ کو اس بیماری کی علامات کا پتا ہے کہ جن کے ذریعے اس کی نشان دہی ہوتی ہے؟

عاطف: جی ہاں! اس بیماری میں جسم پر سرخ دھبے نمایاں ہوتے ہیں، سر میں درد، آنکھوں میں درد، ریڑھ کی ہڈی میں بھی درد ہوتا ہے۔ دراصل ڈینگی وائرس ہمارے خون کے سفید خلیوں کی تعداد کو خطرناک حد تک کم کر دیتا ہے۔

ثاقب: پھر تو جب کسی میں یہ علامتیں ظاہر ہوں، فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے اور علاج میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

عاطف: جی ہاں بالکل! مریض کو دوسرے لوگوں سے الگ رکھنا چاہیے اور اسے نرم غذا دینی چاہیے۔

ثاقب: عاطف بھائی! آپ کو یہ معلومات کہاں سے ملیں؟

عاطف: انٹرنیٹ اور مختلف اخبارات سے ڈینگی کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

ثاقب: اس سے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہ بیماری اتنی خطرناک نہیں ہے بلکہ اس بیماری کے متعلق کم آگاہی خطرناک ہے۔ اگر لوگوں کو اس بیماری کے بارے میں آگاہی اور شعور ہو تو وہ اس سے بچ سکتے ہیں۔

عاطف: حکومت بھی اس بیماری سے بچاؤ کے لیے خاطر خواہ کردار ادا کر رہی ہے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے بھی عوام میں شعور اور واقفیت بڑھ رہی ہے۔

ثاقب: درحقیقت یہ بیماری ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" (سورۃ الروم آیت: 41)

ترجمہ: زمین پر جو فسادات نمودار ہوتے ہیں وہ انسانوں کے اپنے ہاتھوں کے کرتوت ہیں۔ ایک شاعر کے بقول:

جاری ہے ازل سے یہی قانونِ الٰہی
اعمال بگڑتے ہیں تو آتی ہے تباہی

عاطف: جی ہاں! نہ صرف یہ بیماری بلکہ آج کل تو نت نئی بیماریاں پھیل رہی ہیں، جن کا پہلے نام و نشان بھی نہ تھا۔ ہمیں اپنے اعمال درست کرنے چاہییں اور اللہ سے رجوع کرنا چاہیے۔

ثاقب: آپ نے بالکل بجا فرمایا۔

عاطف: اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور اس جیسی تمام موذی بیماریوں سے بچائے۔

ثاقب: آمین: آپ کا بہت شکریہ بھائی عاطف! آپ نے مجھے مفید معلومات سے آگاہ کیا۔ میں آج ہی اپنے گھر والوں اور دوستوں کو معلومات فراہم کروں گا۔ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ زوہیب کو اس مرض سے نجات عطا فرمائے۔

عاطف: آمین۔

(وقفہ کے اختتام کی گھنٹی بجتی ہے تو دونوں دوست اپنی جماعت کے کمرے کی طرف چلے جاتے ہیں۔)

10 دو دوستوں کے درمیان موبائل فون کے فوائد اور نقصانات پر مکالمہ

(ملتان بورڈ، گوجرانوالہ بورڈ، راولپنڈی بورڈ 2023)

(اتوار کے دن حارث موٹر سائیکل پر سوار ہو کر کہیں جا رہا ہے کہ گلی کی نکڑ پر اس کی نظر اویس پر پڑتی ہے۔ حارث اویس کے پاس آ کر اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

حارث: السلام علیکم! اویس کیسے ہو؟

اویس: وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔ (حارث کے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ کیا ہے؟

حارث: ہیڈ فون ہے بھئی اور کیا؟

اویس: وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ لیکن دورانِ سفر اس کا کیا کام؟

حارث: (ہنستے ہوئے) ارے بھئی! تم بھی بالکل قدامت پسند واقع ہوئے ہو۔ سفر کی بوریت اس سے کم ہو جاتی ہے۔ آدمی گانے سننے میں مگن ہو جاتا ہے تو اُسے سفر کی کوفت بھول جاتی ہے۔

اویس: لیکن اس محویت میں تم کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتے ہو، کیوں کہ اس طرح تم مکمل توجہ سے ڈرائیونگ نہیں کر سکتے۔

حارث: کیوں بھئی؟ ڈرائیونگ کا سماعت سے کیا تعلق؟ اس کے لیے تو ہاتھ، پاؤں اور آنکھیں ہوتی ہیں۔

اویس: نہیں! اس طرح دماغی انہماک بٹ جاتا ہے۔

حارث: ہاں! یہ تو واقعی ٹھیک ہے۔

اویس: پتا نہیں یار آج کل موبائل فون نوجوان نسل میں اتنا مقبول کیوں ہو چکا ہے۔

حارث: میرے دوست موبائل فون بوریت دور کرنے کا بہترین ذریعہ اور ذہنی تفریح کا باعث ہے۔

اویس: وہ کیسے؟

حارث: دیکھو بھئی! موبائل فون پر آپ گیمز، گانے وغیرہ سن سکتے ہیں۔

اویس: یہ تو وقت کا ضیاع ہے۔

حارث: صرف یہی نہیں آج کل تو میموری کارڈ اور یو۔ ایس۔ بی وغیرہ نے موبائل کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ آپ اس پر اپنی پسند کی ویڈیوز بھی دیکھ سکتے ہیں۔

اویس: (طنزاً ہنستے ہوئے) اچھا

حارث: تو پھر ہے نا تفریحِ طبع کا ذریعہ؟

اویس: ہرگز نہیں! البتہ بوریت دور کرنے کی بجائے اخلاقیات دور کرنے کا ذریعہ ہے۔

حارث: اخلاقیات؟ کیا مطلب؟؟؟

اویس: آج حالات تمھارے سامنے ہیں۔ اسی موبائل فون نے نوجوان نسل کو اچھے اخلاق سے محروم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ اخلاقیات سے عاری نوجوان نظر آتے ہیں۔ درحقیقت آج موبائل فون چلتے پھرتے فحاشی کے مراکز بن چکے ہیں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

ہر شام یہاں بجتی ہے اک بزمِ زلیخا ہر صبح یہاں مصر کا بازار لگے ہے

حارث: تمھارا مطلب ہے کہ نوجوان نسل کی تباہی موبائل کے استعمال کا نتیجہ ہے؟

اویس: جی ہاں! نوجوان نسل کی بربادی کے پیچھے موبائل فون کا بڑا ہاتھ ہے۔

حارث: تمھارا خیال ہے کہ نوجوان نسل موبائل فون استعمال نہ کرے؟

اویس: میں نے یہ تو نہیں کہا۔

حارث: پھر کیا خیال ہے تمھارا؟

اویس: موبائل فون ضرور استعمال کریں لیکن ضرورت کے مطابق۔ اعتدال اور میانہ روی کی ضرورت ہے۔

حارث: کیا مطلب؟

اویس: دیکھو بھئی! اب نوجوان ڈیلی پیکجز کی وجہ سے گھنٹوں فضول گفتگو اور SMS کرنے میں وقت ضائع کرتے ہیں۔

حارث: واقعی تمھاری بات تو ٹھیک ہے۔

اویس: موبائل فون ایک نعمت ہے لیکن اس کا استعمال غلط ہو رہا ہے۔ ورنہ موبائل فون ہی تو وہ ذریعہ ہے جس نے دنیا کو گلوبل ویلج (Global Village) میں تبدیل کر دیا ہے۔ موبائل نے فاصلے مٹا دیے ہیں بلکہ اب تو آپ ہزاروں میل دور بیٹھ کر نہ صرف بات کر سکتے ہیں بلکہ اپنے ہم کلام کی براہِ راست تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

حارث: فاصلوں کا مٹانا تو واقعی موبائل کا عظیم کارنامہ ہے۔

اویس: اس کے علاوہ موبائل سیٹ کے بھی بہت سے فوائد ہیں۔ سٹاپ واچ، کیلکولیٹر، الارم کلاک اور مزید بھی کئی عوامل ہیں جو روزمرہ

کے استعمال کے لیے نہایت موزوں ہیں۔

حارث: واقعی موبائل کا درست استعمال بہت مفید ہے۔

اویس: موبائل کا صحیح استعمال مفید اور غلط استعمال تباہ کن ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ موبائل کو استعمال ضرور کریں مگر ضرورت کے وقت۔

حارث: (کانوں سے ہینڈ فون اتارتے ہوئے) مجھے تمھاری رائے سے اتفاق ہے اور آیندہ بھی میں تمھاری باتوں سے مستفید ہوتا رہوں گا۔

اویس: مجھے خوشی ہے کہ تم ان حقائق کو جانچ کر صحیح فیصلہ کرنے کے قابل ہو گئے ہو۔

حارث: (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا اب چلتے ہیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔

اویس: ٹھیک ہے خدا حافظ!

حارث: خدا حافظ!

(دونوں دوست مخالف اطراف میں رواں دواں ہیں۔ اب حارث موٹر سائیکل آہستہ اور احتیاط سے چلا رہا ہے۔)

11 دو دوستوں کے درمیان برداشت اور صبر و تحمل کے موضوع پر مکالمہ

(عبداللہ اور عمر دونوں دوست ہیں۔ دونوں اتوار کے دن راستے میں ملتے ہیں۔ دونوں کے درمیان سلسلہ کلام یوں شروع ہوتا ہے)

عبداللہ: السلام علیکم! کیا حال ہے؟

عمر: وعلیکم السلام! الحمدللہ، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں خیریت ہے؟ کچھ افسردہ دکھائی دے رہے ہیں آپ؟

عبداللہ: کیا بتاؤں؟ بس اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر اپنا رحم فرمائے!

عمر: جناب کچھ بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے؟

عبداللہ: آج صبح ایک افسوس ناک واقعہ دیکھنے کو ملا۔ جس کی وجہ سے طبیعت افسردہ ہو گئی ہے۔

عمر: اوہ! تو یہ بات ہے۔ اب کچھ تفصیل بھی بتاؤ گے؟

عبداللہ: آج ہمارے محلّہ میں میں دو لوگوں کے درمیان معمولی سی بات پر بحث و تکرار ہوئی۔ بات گالی گلوچ سے ہوتے ہوئے ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ اگر لوگ بیچ بچاؤ نہ کرواتے تو وہ سر پھٹول ہوتی کہ الامان!

عمر: کچھ دن پہلے ہمارے کالج میں بھی دو لڑکوں کے درمیان سیاسی بحث طول پکڑ گئی اور معاملہ مار کٹائی تک پہنچ گیا۔

عبداللہ: دراصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عدم برداشت کا رویہ بڑھتا جا رہا ہے۔ لوگوں میں صبر و تحمل نہیں رہا۔ ذرا سی بات پر لوگ آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔

عمر: یہ غصہ اور عدم برداشت ہی ہے جو بھائیوں میں نا اتفاقی، میاں بیوی میں طلاق اور آپس میں منافرت اور قتل و غارت کا موجب ہے۔

عبداللہ: بلاشبہ یہ ام المسائل ہے۔ عدالتوں کے کیس اٹھا کر دیکھ لیں، تمام جرائم اور قتل و غارت کی بنیادی وجوہات میں بے صبری اور عدم برداشت سرِ فہرست ہے۔ حکومتی ایوان ہو یا ٹی۔ وی ٹاک شو، ہمارا معاشرہ عدم برداشت کی وجہ سے پگھلی منڈی کا منظر پیش کر رہا ہے۔

عمر: جی بالکل، آج ہماری قوم کا سب سے بڑا مسئلہ یہی عدم برداشت اور صبر و تحمل کا فقدان ہے۔

عبداللہ: ہماری پستی اور زوال کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم وقتی طور پر جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ جن قوموں میں عدم برداشت اور بے صبری جیسی برائیاں پیدا ہو جائیں وہ عدم تحفظ، عدم اعتماد اور افراتفری کا شکار ہو کر رہتی اپنا مقدر بنا لیتی ہیں۔

عمر: جس طرح زمانہ جاہلیت میں معمولی باتوں پر جھگڑا شروع ہوتا تو خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں اور نسل در نسل دشمنیاں چلتی رہتی تھیں، آج ہمارا معاشرہ بھی زمانہ جاہلیت کا منظر کشی پیش کر رہا ہے۔ گھریلو زندگی ہو یا معاشرتی زندگی، سیاست ہو یا مذہب ہر جگہ گالی گلوچ کلچر فروغ پا رہا ہے۔ یہاں تک کہ دینی و مذہبی حلقوں میں بھی رواداری اور صبر و تحمل جیسی صفات معدوم ہو چکی ہیں۔

عبداللہ: اگر صبر و تحمل سے کام نہ لیا جائے تو زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارے پیارے رسول ﷺ کی تمام زندگی صبر و تحمل اور برداشت کا بہترین نمونہ ہے۔

عمر: صبر و تحمل کا مظاہرہ اعلیٰ اخلاقی صفت ہے۔ غصہ اور اشتعال شیطانی اثر ہے، اس لیے ہمارے دینِ اسلام نے ہمیشہ عفو و درگزر کی

تعلیم دی ہے۔

عبداللہ: رسول ﷺ نے فرمایا:

"طاقت ور وہ نہیں جو دشمن کو پچھاڑ دے بلکہ طاقت ور وہ ہے جو غصہ میں خود کو قابو رکھے۔" (صحیح مسلم)

عمر: میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول ﷺ نے پوری زندگی کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا، ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیا۔ پتھر مارنے والوں کو بھی دعائیں دیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کے جانی دشمن بھی آپ ﷺ کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

عبداللہ: افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اسی رسول کی امت آج معمولی باتوں پر آپس میں دست و گریباں ہے۔ آج ہماری زندگیاں بے سکونی، مایوسی، اضطراب، ڈپریشن، عدم تحفظ اور عدم استحکام کا شکار ہو چکی ہیں۔ ہمارے معاشرے سے اخلاقیات، برداشت، رواداری اور بھائی چارے کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے۔

عمر: ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کی تربیت کی جائے، انھیں قرآن و سنت کے احکامات بتائے جائیں اور رسول اکرم ﷺ کی سیرت و سوانح بتائی جائے۔ صبر و تحمل اور برداشت کے فوائد و ثمرات سے آگاہ کیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"جو لوگ صبر کرنے والے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں ان کے لیے بخشش اور بڑا ثواب ہے۔" (سورہ ہود: 11)

عبداللہ: لوگوں کو اختلافِ رائے کے آداب سے آگاہ کیا جائے۔ دوسروں کی بات تحمل سے سننے کا عادی بنایا جائے۔

عمر: یہ بات بھی درست ہے، لیکن غصے کو کیسے کنٹرول کیا جائے؟

عبداللہ: رسول اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق جب کسی کو غصہ آئے تو اسے پانی پی لینا چاہیے، اگر وہ کھڑا ہو تو اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے۔ مزید یہ کہ جب کسی کو غصہ آئے اور مار دھاڑ اور توڑ پھوڑ کو جی چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح سمجھائے کہ مجھے دوسروں پر جو قدرت حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ کو مجھ پر قدرت حاصل ہے، اگر میں نے غصہ میں کسی کی دل آزاری یا حق تلفی کر ڈالی تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے غضب سے میں کس طرح محفوظ رہ سکوں گا۔

عمر: یہ تو آپ نے بہت زبردست حل بتایا۔

عبداللہ: صبر و تحمل اور عفو و درگزر کو اپنی زندگیوں میں فروغ دینے ہی سے ہماری سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور سماجی زندگی خوش گوار ہو سکتی ہے اور امن کا گہوارا بن سکتی ہے۔

عمر: اچھا اب میں چلتا ہوں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔

عبداللہ: جی ضرور، آج کی ملاقات بہت مفید رہی۔

عمر: خدا حافظ!

عبداللہ: خدا حافظ!

(دونوں ایک دوسرے کو سلام کرتے ہوئے اپنے اپنے راستوں پر گامزن ہو گئے)

12 استاد اور شاگرد کے درمیان وقت کی پابندی کے موضوع پر مفصل مکالمہ

(شعیب فرسٹ ایئر کا طالب علم ہے۔ تفریح کے وقت وہ سٹاف روم کے سامنے سے گزرتا ہے تو ان کے انچارج راؤ آصف محمود صاحب اسے دیکھ کر اپنے پاس بلاتے ہیں اور دونوں کے درمیان سلسلہ کلام یوں شروع ہوتا ہے)

شاگرد: السلام علیکم سر!

استاد: وعلیکم السلام۔ شعیب آج آپ پہلے لیکچر میں موجود نہیں تھے؟

شاگرد: سر آج میں دیر سے کالج پہنچا تھا۔ اس لیے آپ کا لیکچر نہیں لے سکا۔

استاد: اس سے پہلے بھی میں نے کئی بار آپ کو گیٹ کے باہر دیر سے آنے والے طلبہ میں کھڑے دیکھا ہے۔

شاگرد: جی سر، بس دیر ہو جاتی ہے۔

استاد: کیا وجہ ہے جو روز نہ دیر ہو جاتی ہے؟

شاگرد: (شرمندگی سے) بس سر آنکھ نہیں کھلتی۔
استاد: رات کتنے بجے سوتے ہو؟
شاگرد: تقریباً دو بجے سر۔
استاد: اتنی دیر تک پڑھائی کرتے ہو؟
شاگرد: نہیں سر، ٹی۔وی دیکھتا ہوں، یا موبائل پر گیم کھیلتا ہوں۔
استاد: صبح کی نماز بھی نہیں پڑھتے ہو گے؟
شاگرد: (ندامت سے سر جھکائے) آنکھ نہیں کھلتی سر۔
استاد: کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمھیں پیاری ہے

تمھاری آنکھ کیسے کھلے، جب تم رات گئے تک ٹی۔وی اور موبائل گیم میں مصروف رہو گے۔ تمھیں احساس بھی ہے تم اپنا قیمتی وقت کن فضول کاموں میں ضائع کر رہے ہو؟

شاگرد: سر میں نے کئی بار ان عادات کو چھوڑنے کی کوشش کی ہے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔
استاد: (نرمی سے) دیکھو بیٹا۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم خود کو کس چیز کا عادی بنا لیں۔ وقت کی قدر پہچانو۔ یہ عمر وقت ضائع کرنے کی نہیں ہے۔ اور تمھارے امتحان سر پر ہیں ان دنوں تو فضول کاموں میں الجھنے کی بالکل گنجائش نہیں۔
شاگرد: لیکن سر کھیل اور تفریح بھی تو ضروری ہے۔
استاد: لیکن ہر چیز کا ایک وقت اور مقدار ہوتی ہے۔ کسی بھی چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے۔ ہر چیز اعتدال اور توازن کے ساتھ ہی مناسب ہوتی ہے۔
شاگرد: جی سر، درست فرمایا آپ نے۔
استاد: اس وقت آپ کی پہلی ترجیح آپ کی تعلیم ہونی چاہیے۔ کھیل کود اور تفریح کے لیے بھی تھوڑا بہت وقت نکالو۔ لیکن ان میں اتنا گم مت ہو جاؤ کہ دیگر تمام اہم چیزیں فراموش کر دو۔ نہ ان چیزوں کو اپنے سر پر اتنا سوار کرو کہ تعلیم اور دیگر تعمیری سرگرمیاں دب کر رہ جائیں۔
شاگرد: لیکن سر! صبح جلدی نہیں اٹھا جاتا۔ میں کیا کروں؟
استاد: دراصل آپ رات کو دیر سے سوتے ہیں اس لیے صبح دیر سے آنکھ کھلتی ہے۔ رات کو اگر جلد سو جاؤ تو صبح خود بخود آنکھ کھل جاتی ہے۔ رات گئے تک جاگنا صحت کے لیے بھی درست نہیں ہوتا۔ وقت پر سونا اور مناسب نیند بہت ضروری ہے۔
شاگرد: اگر پھر بھی آنکھ نہ کھلے تو؟
استاد: شروع میں عادت بنانے کے لیے الارم لگا لیا کرو۔ کچھ ہی عرصہ بعد جلد اٹھنا آپ کی عادت بن جائے گی۔ دوسرا نماز کی پابندی شروع کر دو۔ تمھارا تمام وقت خود بخود منظم ہو جائے گا۔
شاگرد: ان شاء اللہ سر! میں آج ہی سے باقاعدہ نماز شروع کرتا ہوں۔
استاد: (کمر پر تھپکی دیتے ہوئے) بہت خوب! نماز کی اس پابندی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمھاری پوری زندگی وقت کی پابندی میں ڈھل جائے گی اور ہر چیز ایک ترتیب میں خود بخود آ جائے گی۔ ایک کامیاب شخص وہی ہوتا ہے جس کی زندگی کا ہر لمحہ منظم ہو۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے کس وقت کیا کرنا ہے۔ ایک طالب علم کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ کھیل، پڑھائی اور نیند کے لیے کتنا اور کون سا وقت مناسب ہے؟
شاگرد: بہت بہتر سر! اب میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ صبح جلدی اٹھا کروں گا۔
استاد: کھیل اور ٹی۔وی کی جانب کم سے کم دھیان دو۔ کالج کے بعد کی مصروفیات کے لیے ایک شیڈول ترتیب دو۔ روزانہ کالج میں جو پڑھایا جاتا ہے، اسے گھر آ کر دہراؤ تا کہ وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ اگر وقت پر تھوڑا تھوڑا کر کے یاد نہ کیا جائے تو وہ ذہن میں بوجھ بن جاتا ہے اور شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور امتحان کے وقت ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہر مضمون کو مناسب وقت دو۔ روز کا کام روز کرو، اسے کل پر اٹھا کر نہ رکھو۔

شاگرد: جی سر، میں آج ہی اپنا شیڈول ترتیب دیتا ہوں۔
استاد: اپنی ترجیحات کو درست کرو۔ وقت کی پابندی کرو۔ جو چیز زیادہ اہم اور ضروری ہے اسے پہلی ترجیح پر رکھو۔ باقی دیگر چیزوں کو بعد کے لیے اُٹھا رکھو۔ ہر چیز کو اس کی ضرورت اور اہمیت کے مطابق وقت دو۔ دنیا میں وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو اپنی ترجیحات کو متعین کرتی ہیں۔ عقل مند شخص وہی ہوتا ہے جو یہ جانتا ہے کہ کس وقت کون سی چیز زیادہ اہم ہے اور کسے ترجیح دی جائے اور کسے بعد کے لیے اٹھا کر رکھا جائے۔ بقول اقبال:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

شاگرد: سر میں آیندہ احتیاط کروں گا اور دوبارہ شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔
استاد: میری بات یاد رکھو! وقت انتہائی قیمتی شے ہے، یہ لوٹ کر نہیں آتا۔ وقت کو ضائع کرنے والی قومیں کبھی آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ وقت ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔ جس طرح ہوا کا گزرا ہوا جھونکا واپس نہیں لایا جا سکتا ہے، منھ سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر واپس کی راہ نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح گزرا وقت بھی انسانی دسترس سے باہر چلا جاتا ہے۔ وقت کا درست استعمال اور اس کی قدر کرنے والے ہی کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں۔
شاگرد: سر آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ کبھی وقت ضائع نہیں کروں گا اور ہمیشہ وقت کی پابندی کروں گا۔
استاد: (کمر پر تھپکی دیتے ہوئے) شاباش بیٹا۔ اب کلاس میں جاؤ تمھارا لیکچر شروع ہونے والا ہے۔
شاگرد: بہت شکریہ جناب۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

(شاگرد اور استاد دونوں کلاس کی جانب بڑھ جاتے ہیں)

13 ڈاکٹر اور مریض کے درمیان کورونا وبا سے بچاؤ کے حوالے سے مفصل مکالمہ

(مریض کھانستا ہوا کلینک میں داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسے دور رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور یوں ہم کلام ہوتا ہے)

ڈاکٹر: ارے رُکیے رُکیے! وہیں کرسی پر بیٹھ جائیے۔
مریض: ڈاکٹر صاحب ایسی بھی کیا بے مروتی۔ بس ذرا سی کھانسی ہے۔
ڈاکٹر: (کرسی سے اٹھ کر قریب آتا ہے اور کچھ فاصلے پر کھڑا ہو جاتا ہے) السلام علیکم! آپ کو کھانسی ہے اسی لیے تو رُکنے کا کہا ہے۔ آپ نے ماسک بھی نہیں لگایا ہوا۔
مریض: مجھے کون سا کرونا ہوا ہے جو ماسک پہنوں؟ میں تو کھانسی اور نزلہ کی دوائی لینے آیا ہوں۔
ڈاکٹر: کیا آپ کو کرونا کی علامات معلوم ہیں؟
مریض: یہ ڈاکٹروں کا کام ہے۔ ہم تو اَن پڑھ آدمی ہیں جناب۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم یہ کرونا ورونا کیا بلا ہے؟
ڈاکٹر: کرونا کی بیماری عالمی سطح پر پھیل چکی ہے۔ حیرت ہے آپ ابھی تک اس سے بے خبر ہیں؟
مریض: ہم دیہاڑی دار بندے ہیں ہمیں کہاں ایسی چیزوں کی خبر۔ اب ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو آپ بتا دیجیے۔
ڈاکٹر: کرونا وائرس کی ایک حالیہ قسم نول کرونا وائرس یا Covid-19 ہے جو نظامِ تنفس کی شدید ترین بیماری اور نزلہ زکام کی عام اقسام پھیلانے کا باعث ہے۔
مریض: یعنی نزلہ زکام کرونا وائرس سے ہوتا ہے؟
ڈاکٹر: لازمی نہیں کہ ہر نزلہ زکام کا باعث کرونا وائرس ہی ہو لیکن کرونا وائرس کی عام علامات زکام یا عام نزلے سے ملتی جلتی ہیں۔
مریض: یہ بیماری شروع کہاں سے ہوئی؟
ڈاکٹر: اس نئے کرونا وائرس سے ہونے والی بیماری کی پہلی بار شناخت چین کے شہر ووہان میں ہوئی۔ وہاں سے یہ بیماری دنیا بھر میں پھیل گئی۔
مریض: یہ بیماری کیسے پھیلتی ہے؟
ڈاکٹر: یہ وائرس متاثرہ شخص کی کھانسی یا چھینک سے خارج ہونے والی رطوبتوں کے چھوٹے چھوٹے قطروں سے پھیلتا ہے اور ایسی

چیزوں کی سطح کو چھونے سے پھیلتا ہے جو کرونا وائرس سے آلودہ ہو چکی ہوں۔ کرونا وائرس کسی بھی چیز کی سطح پر کئی گھنٹے زندہ رہ سکتا ہے۔ البتہ یہ کسی بھی عام جراثیم کش محلول سے ختم ہو جاتا ہے۔

مریض: بہت بہتر جناب۔ اس بیماری کی واضح علامات کیا ہیں؟

ڈاکٹر: کرونا وائرس کی علامات میں بخار، کھانسی، اور سانس لینے میں دشواری ہونا شامل ہیں۔ بیماری کی شدت کی صورت میں نمونیا اور سانس لینے میں بہت زیادہ مشکل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ یہ بیماری جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

مریض: اوہ اچھا! اس بیماری کی تشخیص کیسے ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر: اس بیماری کی تشخیص کے لیے ٹیسٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ناک کی رطوبت کے ٹیسٹ سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مریض واقعی Covid-19 میں مبتلا ہو چکا ہے۔

مریض: پھر تو مجھے پہلی فرصت میں ہی یہ ٹیسٹ کروانا چاہیے۔

ڈاکٹر: جی بالکل۔ میں آپ کو ٹیسٹ لکھ دیتا ہوں۔ آپ کلینک کی لیبارٹری سے ٹیسٹ کروا سکتے ہیں۔

مریض: ڈاکٹر صاحب! اس بیماری سے کیسے محفوظ رہا جا سکتا ہے؟

ڈاکٹر: اپنے ہاتھ اور منھ بار بار صابن سے دھوئیے۔ کھانستے یا چھینکتے وقت اپنا منھ ٹشو یا رومال سے ڈھانپ لیجیے اور اگر یہ دستیاب نہ ہو تو اپنی کہنی موڑ کر بھی منھ ڈھانپا جا سکتا ہے۔ استعمال شدہ ٹشو اور رومال ایسے کوڑا دان میں ضائع کر دیں جو ڈھکن سے بند ہو سکتا ہو۔ ملنے جلنے کے دوران میں کم از کم چھ فٹ کا فاصلہ رکھیں۔ سلام یا مصافحہ کے لیے ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے سے گریز کریں۔ ماسک کا استعمال کریں۔ پہلی فرصت میں ویکسین لگوائیں۔ پُر ہجوم جگہوں اور عوامی مقامات پر جانے سے گریز کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے:

"جب تم سن لو کہ کسی جگہ طاعون کی وبا پھیل رہی ہے تو وہاں مت جاؤ۔ لیکن جب کسی جگہ یہ وبا پھوٹ پڑے اور تم وہیں موجود ہو تو اس جگہ سے نکلو بھی مت" (صحیح بخاری: 5728)

مریض: بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ میں ابھی ماسک منگوا کر لگاتا ہوں اور آپ مجھے کرونا کی تشخیص کے لیے ٹیسٹ لکھ دیجیے۔ میں ابھی ٹیسٹ کروانا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر: (ٹیسٹ لکھتے ہوئے) اگر خدانخواستہ آپ کا ٹیسٹ پوزیٹو آتا ہے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کچھ دن کے لیے آپ کو قرنطینہ ہونا پڑے گا اور آپ کا مناسب علاج ہوگا۔ چند دن کے علاج کے بعد آپ صحت یاب ہو جائیں گے۔ اور اگر آپ کا ٹیسٹ نیگیٹو آتا ہے تو آپ پہلی فرصت میں ویکسین لگوا لیجیے۔

مریض: یہ ویکسین کیا ہوتی ہے؟

ڈاکٹر: ویکسین ایک چھوٹے سے انجیکشن کی صورت میں لگائی جاتی ہے۔ یہ صحت مند انسان کو کرونا وائرس کے خلاف مدافعت فراہم کرتی ہے۔ ماہرین نے بڑی جاں فشانی سے کرونا وائرس کی ویکسین تیار کی ہے۔ ویکسین کی وجہ سے اس وائرس پر قابو پانے میں بڑی مدد ملی ہے۔

مریض: یہ ویکسین کہاں سے اور کتنے کی ملے گی؟

ڈاکٹر: حکومت کے مقرر کردہ سنٹرز پر یہ ویکسین مفت دستیاب ہے۔ آپ کسی بھی وقت وہاں جا کر ویکسین لگوا سکتے ہیں۔

مریض: ڈاکٹر صاحب ویکسین کے بارے میں بہت سی افواہیں بھی گردش کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر: آپ اس بارے میں کسی بھی افواہ پر کان مت دھریں اور اپنے معالج کی بات پر بھروسا کریں۔ ایک مستند ڈاکٹر ہی کسی بھی بیماری کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کر سکتا ہے۔

مریض: کیا ویکسین لگوانے کے بعد بھی احتیاطی تدابیر ضروری ہوں گی؟

ڈاکٹر: جی بالکل۔ ویکسین لگوانے کے بعد بھی احتیاطی تدابیر ضروری ہوں گی۔ یہ وبا ان لوگوں کے لیے زیادہ خطرناک ہے جو پہلے سے مختلف بیماریوں کا شکار ہیں۔

مریض: آپ کا بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے مجھے بہت مفید معلومات فراہم کیں۔ آپ کی وجہ سے میری بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

ڈاکٹر: شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میرا فرض ہے۔

مریض: خدا حافظ ڈاکٹر صاحب! دعا کیجیے گا۔

ڈاکٹر: خدا ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین! خدا حافظ!

(مریض ٹیسٹ کروانے کے لیے لیبارٹری کی جانب رخ کرتا ہے اور ڈاکٹر دوسرے مریضوں کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے)

14 دو دوستوں کے درمیان اردو زبان کی اہمیت کے موضوع پر مکالمہ

(شکیل اور نوید دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔ شکیل وقفہ کے دوران میں کالج کے صحن میں بیٹھا کسی کتاب کے مطالعہ میں محو ہے۔ نوید اس کے پاس آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

نوید: السلام علیکم!

شکیل: وعلیکم السلام۔ نوید بھائی کیسے ہیں آپ؟

نوید: الحمد للہ! میں ٹھیک ہوں۔ کون سی کتاب کا مطالعہ ہو رہا ہے؟

شکیل: ہماری قومی زبان اردو سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں اردو زبان کی اہمیت و ضرورت بیان کی گئی ہے۔

نوید: اب تو انگلش کا دور دورہ ہے اور آپ ہیں کہ اردو میں سر کھپا رہے ہیں۔

شکیل: یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ دراصل انگریزی زبان فیشن بن چکی ہے اور ہر خاص و عام انگلش سے مرعوب دکھائی دیتا ہے۔ اس کے باوجود اردو زبان کی اہمیت و افادیت تسلیم شدہ ہے۔

نوید: بھائی! میں تو یہی کہوں گا کہ دنیا کے ساتھ چلو! سرکاری ہوں یا پرائیویٹ ادارے، ہر جگہ انگلش کو ترجیح دی جاتی ہے۔

شکیل: میرے خیال میں تو یہ سب غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں میں قومی زبان کو تمام شعبوں میں رائج کیا جاتا ہے، ایک پاکستان ہی ایسا ملک ہے، جہاں دورِ غلامی کی یادگار انگریزی زبان رائج ہے۔

نوید: آج کل تو چھوٹے بچے بھی روانی سے انگریزی بولتے ہیں۔

شکیل: زندہ قومیں اپنی قومی زبان سے محبت کرتی ہیں اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے بھرپور کوشش کرتی ہیں۔

نوید: اگر ایسا ہے تو پھر انگریزی زبان کو زیادہ فوقیت کیوں دی جاتی ہے اور اردو زبان کو سرکاری سطح پر کیوں اختیار نہیں کیا جاتا۔

شکیل: یہ سب مرعوبیت کی نشانی ہے۔ ترقی پذیر قوموں کا المیہ یہی ہے کہ وہ اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسروں کی نقالی میں فخر محسوس کرتی ہیں۔

نوید: ہمارے ہاں تو ایک بڑا طبقہ انگریزی زبان کا دل دادہ ہے اور اہلِ اقتدار تو ہمیشہ انگلش سیکھنے کی غرض سے اپنے بچوں کو بیرونِ ملک بھجواتے ہیں۔

شکیل: ضرورت کے تحت انگلش سیکھنا اور پڑھنا منع نہیں ہے۔ لیکن انگلش کو سرکاری اور پرائیویٹ دفاتر میں، تعلیمی اداروں اور عام بول چال میں استعمال کرنا اور اردو کو حقیر سمجھنا غلط ہے۔

نوید: دراصل انگریزی بولنے والے کو تعلیم یافتہ سمجھا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اکثر لوگ اردو میں بھی کئی الفاظ انگریزی کے استعمال کرتے ہیں۔

شکیل: اردو زبان پسماندہ یا کم تر نہیں ہے بلکہ ادب و احترام کے الفاظ اردو میں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ مثلاً: کوئی لڑکا کہے کہ "یہ میرے ابو جان ہیں" اسی طرح انگلش میں اگر کہے کہ "یہ میرا ڈیڈی ہے" تو ادب والا لفظ کون سا ہے "ابو جان" یا "ڈیڈی"؟

نوید: یہ بات تو ٹھیک ہے کہ ابو جان کہنا ہی زیادہ ادب والا لفظ ہے، لیکن انگریزی زبان موجودہ دور میں بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

شکیل: آپ کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ اردو زبان بھی اس وقت دنیا میں بولی جانے والی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔

نوید: حکمرانوں کا فرض ہے کہ اردو زبان کو فروغ دینے کے اقدامات کریں۔

شکیل: ایسا ہی ہونا چاہیے! آپ غور کریں کہ روس میں روسی زبان رائج ہے، جرمنی میں جرمن زبان، جاپان میں جاپانی زبان اور چین میں چینی زبان کو ہر شعبے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا میں ہر ملک کے لوگ اپنی زبان بول کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ایک ہمارے ہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ یہ ہمارے احساس کمتری کی علامت ہے کیوں کہ غلام قومیں بالادست قوموں کا اثر قبول کرتی ہیں۔

نوید: آپ کی باتوں میں وزن ہے اور دل کو لگ رہی ہیں۔

تشکیل: شکریہ نوید، اپنی قومی زبان کی اہمیت کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں کہ جب چین کے وزیر اعظم چو این لائی پاکستان تشریف لائے تو انگریزی میں پیش کیے گئے سپاس نامے کا جواب انھوں نے چینی زبان میں یہ کہہ کر دیا کہ "چین ابھی گونگا نہیں ہوا" یہ زندہ قوموں کا نشان۔

نوید: ہمارے ہاں تو پہلی کلاس سے انگلش کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے اور طلبہ اپنی ابتدائی تعلیم کے دس سال محض انگریزی کی اصطلاحات سیکھنے میں صرف کر دیتے ہیں۔

تشکیل: یہی تو مسئلہ ہے۔ اگر اردو ہی کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے تو جتنا وقت طلبہ انگریزی سیکھنے میں صرف کرتے ہیں وہی وقت علم یا ہنر سیکھنے میں لگا سکتے ہیں۔

نوید: اور پھر مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ انگریزی میں اتنی بھی مہارت حاصل نہیں کر سکتے کہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ آپ کے خیال میں اردو کو "انگریزیت اور غیر ملکی کلچر" سے کیسے بچایا جا سکتا ہے اور اردو کی اہمیت کو کیسے عوام الناس پر اجاگر کر سکتے ہیں؟

تشکیل: ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت سنجیدگی سے قائد کے فرمان کے مطابق اردو زبان کو سرکاری سطح پر رائج کرے کیوں کر

تشکیل ارض پاک میں اردو کا ہاتھ ہے — اب کا نہیں یہ ساتھ، یہ صدیوں کا ساتھ ہے

نوید: آپ کی باتوں سے میرا دل مطمئن ہوا ہے اور اردو کی اہمیت و افادیت سے آگاہی ہوئی ہے۔

تشکیل: ہمیں اس بات پر فخر محسوس کرنا چاہیے کہ اردو ہی ہماری قومی زبان ہے اور ہمارے لیے ایک بہترین ذریعہ تعلیم ہے۔ اسلامی تہذیب اور ثقافت کی امین ہے۔

نوید: (گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے) آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اتنی مفید باتیں بتائیں۔ آیندہ میں ان شاء اللہ اردو بولنے پر فخر محسوس کروں گا۔

تشکیل: اللہ آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے بھی میری باتیں بڑے دھیان سے سنی ہیں۔

نوید: کلاس کا وقت ہو گیا ہے، اب اجازت دیں۔ اللہ حافظ

تشکیل: اللہ حافظ

(دونوں طالب علم اپنی جماعت کے کمرے کی طرف چل پڑتے ہیں۔)

15 استاد اور شاگرد کے درمیان "ٹی۔ وی کے فوائد" پر مکالمہ

(عمران صاحب اُردو کے لیکچرار ہیں، تفریح کے وقت وہ گراؤنڈ میں ایک بنچ پر بیٹھے سردیوں کی دھوپ کا لطف لے رہے ہیں۔ گیارھویں جماعت سے ان کا ایک شاگرد شعیب ان کے پاس آتا ہے اور ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

شاگرد: السلام علیکم سر!

استاد: وعلیکم السلام!

شاگرد: سر آپ کا کچھ وقت درکار ہے۔ اگر آپ کے پاس فرصت ہو تو؟

استاد: جی بالکل، میں اس وقت فارغ ہوں۔ کہیے کیا کام ہے؟

شاگرد: دراصل کچھ دن سے چند سوالات میرے ذہن میں گردش کر رہے ہیں۔ لیکن کہیں سے ان کا تسلی بخش جواب نہیں مل رہا۔ امید ہے آپ میری ذہنی اُلجھن کو دور کر سکیں گے۔

استاد: میں کوشش کروں گا کہ آپ کو مطمئن کر پاؤں۔ آپ اپنے سوال بتائیے۔

شاگرد: سر گزشتہ جمعہ کو ہمارے اسلامیات کے پروفیسر زاہد صاحب کلاس میں ٹیلی وژن کی مذمت کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ہمارے گھروں میں بے برکتی اور رزق کی تنگی کی بڑی وجہ گھروں میں موجود ٹیلی وژن ہے۔ اور ٹی وی دیکھنے والے کو شدید عذاب ہوگا۔ یہ شیطانی آلہ ہے اور کفار کی مسلمانوں کے خلاف سازش ہے۔ اسے اپنے گھروں سے نکال دیجیے۔

استاد: اچھا تو یہ بات ہے۔

شاگرد: جی، جب سے میں نے یہ سنا ہے میں بہت پریشان ہوں۔ کیا واقعی ایسا ہے؟

استاد: بات دراصل یہ ہے کہ کوئی بھی چیز بذاتِ خود اچھی یا بُری نہیں ہوتی بلکہ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔ مثال کے طور چھری بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ اس کا استعمال اچھا یا بُرا ہو سکتا ہے۔ آپ چھری سے پھل اور سبزیاں کاٹ سکتے ہیں۔ اسی چھری سے لوگوں کے گلے بھی کاٹ سکتے ہیں۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اسے کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ اگر آپ ایک اچھے انسان ہیں تو اس کا اچھا استعمال کریں گے۔

شاگرد: لیکن ٹی۔ وی پر تو ہمارا اختیار نہیں ہوتا ہے۔ وہ جو دکھاتا ہے ہمیں دیکھنا پڑتا ہے۔

استاد: ٹی وی کا ریموٹ ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے چینل تبدیل کرنا ہمارے اختیار میں ہوتا ہے۔ جس چیز کو لوگ زیادہ دیکھنا پسند کرتے ہیں، ٹی وی چینلز وہی دکھاتے ہیں۔ جس پروگرام کو لوگوں میں پذیرائی نہیں ملتی وہ نشر ہونا بند ہو جاتا ہے۔

شاگرد: کسی حد تک یہ بات درست ہے۔

استاد: ٹی۔ وی دورِ حاضر کی سب سے اہم ایجاد ہے۔ تصویر اور ویڈیو ابلاغ کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اس نے ذرائع ابلاغ کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ میڈیا تفریح کی سب سے زیادہ وسیع اقسام میں سے ایک ٹی وی بھی ہے۔ وہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ٹیلی وژن کی ایجاد اسی کا مصداق ہے۔

شاگرد: سر زاہد صاحب تو کہتے ہیں کہ ٹی۔ وی فحاشی پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے؟

استاد: دراصل ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں، یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس کا کون سا رخ دیکھ رہے ہیں۔

شاگرد: اچھا تو دوسرا رخ کیا ہے؟

استاد: ٹی۔ وی دنیا بھر کے مختلف لوگوں اور تہذیبوں کو جاننے کا ایک ذریعہ ہے۔ موسم، آب و ہوا، حادثات اور بڑے بڑے واقعات کے بارے میں پل میں آگاہی مل جاتی ہے۔ ٹی وی تفریح کا بھی ذریعہ ہے کیوں کہ اس پر مختلف قسم کے پروگرام نشر ہوتے ہیں، جن میں ڈاکومنٹریز، تفریحی، ثقافتی، سائنسی، مذہبی اور سیاسی الغرض ہر طرح کے پروگرام ہوتے ہیں۔ ٹیلی وژن آج ہماری زندگیوں کا اہم حصہ بن چکا ہے۔ تفریح، خبریں اور علم مہیا کرنے میں ٹی۔ وی کا بڑا اہم کردار ہے۔

شاگرد: یعنی ٹی۔ وی کو تعلیم دینے، خبریں اور تفریح فراہم کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

استاد: جی بالکل، کیوں نہیں، ان سب مقاصد کے لیے ٹی۔ وی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹیلی وژن عوامی خدمت کے اعلانات اور اشتہارات کے لیے ایک آلے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ مختلف مصنوعات، سروسز اور برانڈز کی تشہیر ٹی وی ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

شاگرد: یعنی ٹی۔ وی عوام الناس کی رہنمائی کا ذریعہ ہے اور رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے ایک مؤثر ذریعۂ ابلاغ ہے۔

استاد: جی آپ درست سمجھے۔ ٹی۔ وی دیکھنے والے حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہتے ہیں۔ خبروں اور مختلف ٹاک شوز کے ذریعے ملکی و عالمی حالات اور سیاسی صورتِ حال سے باخبر رہتے ہیں۔

شاگرد: واقعی سر، یہ بات میں نے بھی نوٹ کی ہے کہ جو لوگ باقاعدہ ٹی۔ وی دیکھتے ہیں وہ ٹی وی نہ دیکھنے والوں کی نسبت حالاتِ حاضرہ سے زیادہ باخبر رہتے ہیں۔

استاد: مزید یہ کہ ٹی۔ وی ذہن کو وسعت دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے، اس کے ذریعے آپ نئی نئی چیزیں دریافت کر سکتے ہیں، جیسے ڈاکومنٹری دیکھتے وقت، آپ ایسی چیزیں سیکھ سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں جو آپ کو شاید ہی اپنی زندگی میں کبھی مل سکیں۔

شاگرد: اس کے علاوہ مزید کیا سیکھ سکتے ہیں؟

استاد: ٹی وی پر صحت سے متعلق معلومات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مختلف بیماریوں سے متعلق ماہرین ٹی۔ وی پر آ کر آگاہی دیتے ہیں۔ مختلف قسم کی ورزشیں سکھائی جاتی ہیں۔ خواتین گھر بیٹھے رنگا رنگ کھانوں کی تراکیب سیکھ سکتی ہیں۔ ٹی۔ وی کے ذریعے آپ فطری مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، جب آپ گھر سے باہر نہیں جا سکتے تو گھر بیٹھے ہی ان جگہوں کی سیر کر سکتے ہیں، جہاں

زندگی میں شاید ہی کبھی آپ کو جانے کا موقع ملے۔ اگر آپ کھیلوں کے شوقین ہیں تو دنیا بھر میں کھیلے جانے والے مختلف قسم کے بین الاقوامی کھیل براہِ راست دیکھ سکتے ہیں۔

شاگرد: یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ٹی وی دیکھنا صحت کے لیے نقصان دہ ہے؟

استاد: ہر چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے۔ بہت زیادہ ٹی۔ وی دیکھنا واقعی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ یہ آنکھوں کی بینائی کے لیے نقصان دہ ہے اور وقت کا ضیاع بھی ہے۔ ٹی۔ وی کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔ یہ منفی جذبات، تشدد، فحاشی و عریانی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ٹی۔ وی کے مثبت اور تعمیری استعمال کو فروغ دیں۔ بقول اقبالؒ:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا   منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

شاگرد: بہت شکریہ سر آپ کا۔ آپ نے بہت مفید معلومات مہیا کیں۔ میرے، بہت سے شکوک و شبہات دور کیے۔

استاد: تفریح کا وقفہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ آپ کلاس روم میں جائیے۔

شاگرد: اللہ حافظ سر!

استاد: اللہ حافظ!

(استاد اور شاگرد دونوں کلاس روم کی جانب چل پڑتے ہیں)

16 طالب علم اور اسٹیشنری فروش کے درمیان اسٹیشنری کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے بارے میں مکالمہ

(دکان دار اپنی دکان کی صفائی میں مشغول ہوتا ہے، اتنے میں ایک طالب علم داخل ہوتا ہے اور ان میں یوں سلسلہ کلام شروع ہوتا ہے)

طالب علم: السلام علیکم! بھائی صاحب کیا حال ہے؟

دکان دار: وعلیکم السلام! آیئے آیئے، آپ کا ہی خیال ہے۔

طالب علم: (مسکراتے ہوئے) ہمارا خیال کیسے؟

دکان دار: صبح سے کوئی گاہک نہیں آیا۔

طالب علم: چلو پھر مجھ سے ہی بسم اللہ سہی!

دکان دار: جی، بتایئے کیا چاہیے آپ کو؟

طالب علم: مجھے کچھ اسٹیشنری چاہیے تھی۔

دکان دار: کچھ کیا جناب، سب لیجیے۔ بس آپ حکم کیجیے۔

طالب علم: بھائی اس مہنگائی کے دور میں تھوڑی سی بھی بہت ہے۔ آپ جب دام بتاتے ہیں تو تھوڑی سی بھی خریدنے کی ہمت نہیں رہتی۔

دکان دار: جناب، ہم کیا کریں، مارکیٹ میں جو ریٹ چل رہا ہوتا ہے وہی لگاتے ہیں۔

طالب علم: اچھا، فی الحال مجھے ایک عدد ڈالر کا پین دیجیے گا۔

دکان دار: یہ لیجیے جناب، کل ہی نیا مال آیا ہے۔

طالب علم: (پین کا معائنہ کرتے ہوئے) دیکھنے میں تو خوب صورت لگ رہا ہے۔ قیمت کیا ہے اس کی؟

دکان دار: جناب اصل ڈالر ہے۔ صرف ایک سو بیس روپے کا ہے۔

طالب علم: (ماتھے پر تیوری چڑھاتے ہوئے) اف! غضب خدا کا۔ ابھی گزشتہ ماہ تو میں نے پچاس روپے کا لیا تھا۔

دکان دار: جی بالکل جناب، اس سے مزید گزشتہ ماہ میں یہی پین تیس روپے کا تھا۔ لیکن گزشتہ دو ماہ سے ہر چیز کے ریٹ چار گنا بڑھ گئے ہیں۔

طالب علم: اچھا، پھر بھی کچھ رعایت کیجیے۔

دکان دار: چلیے، آپ کے لیے صرف سو روپے کا۔

طالب علم: بہت شکریہ جناب!

دکان دار: اور کیا لیں گے؟

طالب علم: دو عدد بال پین، ایک مارکر، ایک پیمانہ، ایک اِنک ریمور اور ایک رجسٹر بھی عنایت کیجیے۔

دکان دار: (تمام چیزیں شاپر میں ڈالتے ہوئے) لگتا ہے امتحان سر پر آ گئے ہیں؟

طالب علم: جی بالکل۔ اگلے ہفتے بورڈ کا پہلا پیپر ہے۔ بس دعا کیجیے۔

دکان دار: (کیلکولیٹر پر ٹوٹل کرتے ہوئے) اللہ تعالیٰ سب کو کامیاب فرمائے۔

طالب علم: آمین!

دکان دار: لیجیے جناب! کل ملا کر ایک ہزار پچاس روپے ہو گئے۔

طالب علم: خدا کا خوف کیجیے بھائی جان! کچھ رعایت کیجیے۔

دکان دار: آپ کے کہنے سے پیشتر ہی میں نے ہر چیز میں پانچ فی صد رعایت کر کے بل بنایا ہے۔

طالب علم: پھر بھی یہ بہت زیادہ ہیں۔ کچھ تو کم کیجیے۔

دکان دار: آٹے میں نمک کے برابر منافع تو ہمارا بھی حق بنتا ہے۔ آخر ہم بھی بال بچوں والے ہیں۔ ہم نے بھی ضرورتیں پوری کرنی ہوتی ہیں۔ گیس اور بجلی کا بل، بچوں کی فیسیں، دکان کا کرایہ۔ وہ کہتے ہیں نا کہ:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے   (خواجہ میر دردؔ)

طالب علم: ارے واہ! آپ تو شاعر ہو گئے ہیں۔

دکان دار: بس مہنگائی نے کسی کو فلسفی بنا دیا ہے تو کسی کو شاعر۔

طالب علم: جی یہ تو ہے۔ اچھا انسانیت کے ناتے اوپر والے پچاس روپے تو چھوڑ دیجیے۔ (منت کرتے ہوئے)

دکان دار: اب ہم ایسا کون سا نفع لے لیتے ہیں۔ چلیے، اوپر والے پچاس چھوڑے۔ آپ صرف ایک ہزار روپے دے دیں۔ اب خوش؟

طالب علم: بہت شکریہ جناب! معلوم نہیں اس مہنگائی کے ہاتھوں عوام کا کیا بنے گا۔ ہر چیز کو آگ لگی ہوئی ہے۔ اب بے چارہ غریب آدمی تو تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ کتابیں خریدنا تو کجا اسٹیشنری خریدنا بھی محال ہو گیا ہے۔

دکان دار: بس، اللہ ہم سب پر اپنا رحم فرمائے اور اس ملک کو مہنگائی کے طوفان سے نجات عطا فرمائے۔

طالب علم: آمین! (سامان اٹھاتے ہوئے) اچھا میں چلتا ہوں۔

دکان دار: جی بالکل، اللہ حافظ!

طالب علم: اللہ حافظ!

(طالب علم سامان لے کر اپنے گھر کی جانب روانہ ہو جاتا ہے)

17 وقت کی پابندی کے موضوع پر بہن اور بھائی کے درمیان مکالمہ

(احمد باہر سے کرکٹ کھیل کر گھر آتا ہے۔ اس کی بہن ہادیہ اسے دیکھتی ہے اور اس سے یوں ہم کلام ہوتی ہے)

ہادیہ: یہ اتنی رات گئے کہاں سے تشریف لا رہے ہیں جناب؟

احمد: (بیٹ سے چھکا لگانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے) نظر نہیں آ رہا۔ آج سنچری بنا کر آ رہا ہے آپ کا بھائی؟

ہادیہ: میں صدقے! میں تو تب مانوں جب بورڈ میں ٹاپ کرو گے۔

احمد: بورڈ میں بھی ٹاپ کر ہی لوں گا۔

ہادیہ: نظر تو نہیں آتا۔ اگر اسی طرح کرکٹ کھیلنے میں وقت ضائع کرتے رہے تو پاس ہوتے بھی نظر نہیں آتے، چہ جائے کہ ٹاپ کرو۔ ذرا بتاؤ مجھے بیالوجی کا کچھ یاد ہے؟

احمد: آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں آخری چند دنوں میں تیار کر لوں گا۔

ہادیہ: یہی تو تمھاری غلط فہمی ہے۔ ابھی تمھیں لگتا ہے کہ امتحان کے دنوں میں تم بآسانی تمام نصاب دہرا لو گے۔ لیکن امتحان کے وقت تمھارے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے اور کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اگر وقت پر تھوڑا تھوڑا یاد نہ کیا جائے تو بعد میں بوجھ بن جاتا ہے اور شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

احمد: لیکن کھیل اور تفریح بھی تو ضروری ہوتی ہے۔

ہادیہ: کھیل اور تفریح بھی ضروری ہوتی ہے۔ آٹے میں نمک کے برابر، نہ کہ نمک میں آٹا۔ تم دوپہر کے گئے اب رات کو کرکٹ کھیل کر

آئے ہو، اور ابھی ٹی۔ وی کے سامنے پھر سے کرکٹ میچ دیکھنے بیٹھ جاؤ گے اور رات بارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھو گے۔

احمد: تمھیں پتا ہے آج کل پی ایس ایل ہو رہے ہیں اور میں وہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بادیہ: امتحانات کے دنوں میں پہلی ترجیح امتحان کی تیاری ہونی چاہیے نہ کہ کھیل اور تفریح۔ کھیل اور تفریح کے لیے بعد میں بہت سا وقت مل جائے گا۔ لیکن اگر امتحان کی تیاری کا وقت کھیل کود میں ضائع کر دیا تو پھر سمجھو ایک سال ضائع ہو گیا۔ اسی لیے اقبالؒ نے کہا تھا:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے   شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

احمد: یہ شعر تو ہمارے اُردو کے پروفیسر بھی بہت سناتے ہیں کہ دنیا میں وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جن کی پہلی ترجیح شمشیر و سناں ہوتی ہے۔ طاؤس و رباب کو پہلی ترجیح دینے والی قومیں ہمیشہ ناکام و نامراد رہتی ہیں۔ عقل مند شخص وہی ہوتا ہے جو یہ جانتا ہے کہ کس وقت کون سی چیز زیادہ اہم ہے اور کسے ترجیح دی جائے اور کسے بعد کے لیے اٹھا رکھا جائے۔

بادیہ: جی بالکل، ایسا ہی ہے۔ جنھوں نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑنے ہوں، اور جنھوں نے ٹاپ پوزیشن حاصل کرنی ہو، وہ پہلے دن سے ہی سخت محنت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ع مسافر شب کو اُٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے

احمد: تو کیا میں سارا سال کھیل کود سے بے گانہ رہوں؟

بادیہ: میں نے یہ کب کہا؟ میں تو تمھیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اپنی ترجیحات درست کرو۔ وقت کی پابندی کرو۔ جو چیز زیادہ اہم اور ضروری ہے اسے پہلی ترجیح پر رکھو۔ باقی چیزوں کو بعد کے لیے اٹھا رکھو۔ ہر چیز کو اس کی ضرورت اور اہمیت کے مطابق وقت دو۔

احمد: اس کے لیے ٹائم ٹیبل بنانا پڑے گا۔

بادیہ: جی بالکل۔ ایک کامیاب شخص وہی ہوتا ہے جس کی زندگی کا ہر لمحہ منظم ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کس وقت کیا کرنا ہے۔ ایک طالب علم کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ کھیل کے لیے کتنا اور کون سا وقت مناسب ہے اور پڑھائی کے لیے کتنا اور کون سا؟

احمد: یہ آپ نے زبردست بات بتائی ہے۔ میں آج ہی اپنا شیڈول ترتیب دیتا ہوں۔

بادیہ: جہاں تک میرا خیال ہے تم نے تو نماز کی پابندی بھی ترک کر دی ہے؟

احمد: کیا کروں باجی، وقت نہیں ملتا۔ روز سوچتا ہوں کل سے شروع کروں گا۔ لیکن عمل نہیں کر پاتا۔

بادیہ:: یعنی دیگر تمام فضولیات کے لیے تمھارے پاس وقت ہے لیکن نماز اور پڑھائی جیسی اہم چیزوں کے لیے تمھارے پاس وقت نہیں؟

احمد: کل سے ضرور پڑھوں گا۔ پکا وعدہ!

بادیہ: کل کی بجائے آج سے کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"بے شک نماز مقررہ اوقات میں مومنوں پر فرض کر دی گئی ہے"   (سورۃ النساء: 123)

ہر نماز کو اس کے وقت پر پڑھا جانا چاہیے۔ تم آج ہی سے نماز کی پابندی شروع کر دو۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمھاری پوری زندگی وقت کی پابندی میں ڈھل جائے گی اور ہر چیز ایک ترتیب میں آجائے گی۔

احمد: ان شاء اللہ میں آج سے ہی نماز کی پابندی شروع کر دیتا ہوں۔

بادیہ: کھیل اور ٹی۔ وی کی جانب کم سے کم دھیان دو۔ کالج کے بعد کی مصروفیات کے لیے ایک شیڈول ترتیب دو۔ روزانہ کالج میں جو پڑھایا جاتا ہے اسے گھر آ کر دہراؤ تاکہ وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ ہر مضمون کو مناسب وقت دو۔ روز کا کام روز کرو، اسے کل پر اٹھا نہ رکھو۔

احمد: بہت بہتر۔ اب میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ میں ضرور ٹاپ کروں گا۔

بادیہ: میری بات یاد رکھو! وقت انتہائی قیمتی شے ہے۔ یہ لوٹ کر نہیں آتا۔ وقت کو ضائع کرنے والی قومیں کبھی آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ وقت ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ جس طرح ہوا کا گزرا ہوا جھونکا واپس نہیں لایا جا سکتا ہے، منہ سے نکلی بات اور کمان سے نکلا

تیر واپسی کی راہ نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح گزرا ہوا وقت بھی انسانی دسترس سے باہر چلا جاتا ہے۔ وقت کا درست استعمال اور اس کی قدر کرنے والے ہی کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں۔

احمد: آپ نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔ میں آپ کی باتوں پر تہِ دل سے عمل کروں گا۔ ان شاء اللہ!

بادیہ: اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب فرمائے۔ آمین!

(دونوں بہن بھائی اپنے اپنے کمروں کی جانب چلے جاتے ہیں)

18 دو دوستوں کے درمیان ابتدائی طبی امداد کے موضوع پر مکالمہ

(محمد احمد افسردہ حالت میں درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ مصعب بن عمیر اس کے قریب آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے)

مصعب بن عمیر: السلام علیکم! خیریت تو ہے آپ اتنے پریشان کیوں بیٹھے ہیں؟

محمد احمد: وعلیکم السلام! خیریت ہی ہے بھئی۔ آج آتے ہوئے ایک حادثہ دیکھ لیا تھا اس لیے اداسی چھائی ہوئی ہے۔

مصعب بن عمیر: اللہ تعالیٰ سب کو محفوظ رکھے۔ کس طرح ہوا تھا وہ حادثہ؟

محمد احمد: کار کی موٹر سائیکل سے ٹکر ہو گئی تھی، موٹر سائیکل سوار بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اس کا بہت زیادہ خون ضائع ہو گیا۔

مصعب بن عمیر: تو کیا وہاں کوئی اس کی مدد کے لیے نہیں تھا؟

محمد احمد: لوگ تو وہاں بہت سے جمع تھے لیکن کوئی بھی اس کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھا۔

مصعب بن عمیر: یہ تو بہت دُکھ کی بات ہے۔ فوری طور پر اسے ابتدائی طبی امداد کی ضرورت تھی۔

محمد احمد: یہ ابتدائی طبی امداد کیا ہوتی ہے؟

مصعب بن عمیر: یہ کسی بھی حادثے کی صورت میں مریض کو دی جانے والی پہلی مدد ہوتی ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

محمد احمد: یہ تو بہت ہی اچھی چیز ہے۔ اس میں کس طرح کی مدد فراہم کی جاتی ہے؟

مصعب بن عمیر: اس میں مریض کی حالت کے مطابق مدد فراہم کی جاتی ہے۔ جیسا کہ فوراً خون روکنا، سانس بحال کرنے کی کوشش کرنا اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ کر باندھنا وغیرہ۔

محمد احمد: زبردست! اچھا یہ بھی بتا دیں کہ اس کی تربیت کہاں سے حاصل کی جا سکتی ہے؟

مصعب بن عمیر: اس کی تربیت کے لیے مختلف ادارے کام کرتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ادارہ بوائز سکاؤٹ اور گرل گائیڈ ہے۔

محمد احمد: کیا سرکاری سطح پر بھی اس کا کوئی انتظام کیا جاتا ہے؟

مصعب بن عمیر: جی بالکل! محکمہ شہری دفاع کی طرف سے باقاعدہ طور پر لوگوں کو ابتدائی طبی امداد کی تربیت دی جاتی ہے اور رضا کار تیار کیے جاتے ہیں۔

محمد احمد: کیا آپ نے بھی اس کی تربیت حاصل کی ہوئی ہے؟

مصعب بن عمیر: جی بالکل! میں نے بوائز سکاؤٹنگ کیمپ میں شرکت کی تھی۔ وہاں ہمیں ابتدائی طبی امداد کی بھرپور تربیت دی گئی تھی۔

محمد احمد: زبردست! مجھے اس حوالے سے کچھ مزید باتیں بھی بتائیں تاکہ میں مشکل وقت میں کسی کی مدد کر سکوں۔

مصعب بن عمیر: آپ کے جذبے سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ سب کی ایسی ہی سوچ ہو تو معاشرے کے دُکھ کافی حد تک کم ہو جائیں۔

محمد احمد: اچھا آپ مجھے یہ بتائیں کہ زخمی شخص کا خون کیسے روکا جا سکتا ہے؟

مصعب بن عمیر: سب سے پہلے تو زخم سے تھوڑا سا اوپر باندھ دیا جائے، اس کے بعد زخم کو صاف کر کے اس پر کس کے پٹی باندھنی چاہیے۔

محمد احمد: اگر کسی کو سانس لینے میں دشواری ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

مصعب بن عمیر: مریض کو سیدھا لٹا کر اس کے سینے پر دباؤ ڈالنا چاہیے۔ اگر پھر بھی سانس بحال نہ ہو تو اسے مصنوعی طریقے سے سانس لینے میں مدد فراہم کی جائے۔

محمد احمد: ہم جلے ہوئے مریض کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

مصعب بن عمیر: اگر کم جلا ہوا ہو تو اس پر صاف پانی بہانا چاہیے، اس سے کپڑا وغیرہ ہٹا دیا جائے اور ٹھنڈا رکھا جائے۔ اگر زیادہ جلا ہوا ہو تو اسے فوری طور پر ہسپتال منتقل کرنا چاہیے۔

محمد احمد: ڈوبنے والے کو کیا ابتدائی طبی مدد دی جا سکتی ہے؟

مصعب بن عمیر: ڈوبنے والے شخص کو بڑی احتیاط کے ساتھ باہر نکالنا چاہیے۔ اپنی حفاظت کا خیال رکھتے ہوئے اسے پانی سے باہر لائیں اور اس کی سانس بحال کرنے کی کوشش کریں۔ فوری طور پر ریسکیو بلائیں۔ ان کے آنے تک مریض کے سینے پر ہلکا ہلکا دباؤ مسلسل ڈالتے رہیں تاکہ اس کی سانس بحال ہو سکے۔

محمد احمد: بہت شکریہ! آپ نے مجھے بہت مفید باتیں بتائی ہیں۔

مصعب بن عمیر: علم تو امانت ہے بھائی۔ اس میں شکریہ کیسا۔ امید ہے کہ آپ اب دوسروں کی مدد میں پیش پیش ہوں گے۔

محمد احمد: ان شاء اللہ! میں پوری کوشش کروں گا۔

مصعب بن عمیر: اب مجھے اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔

محمد احمد: آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ حافظ

(مصعب بن عمیر، محمد احمد سے اجازت لے کر اپنے کسی ضروری کام کے لیے چلا جاتا ہے۔)

19 تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق کے موضوع پر دوستوں کے درمیان مکالمہ

(اظہر بھٹے پر اینٹیں بنانے والے بچوں کو دیکھنے میں مگن ہوتا ہے کہ اس کا دوست بلال اس کے پاس آتا ہے۔ وہ باہم گفت گو کرنے لگتے ہیں)

بلال: السلام علیکم! جناب کے گھور رہیں؟

اظہر: وعلیکم السلام! بھائی جان میں گھور نہیں رہا بلکہ ان بچوں کی قسمت پر غور کر رہا ہوں۔

بلال: کیا ہوا ان کی قسمت کو؟

اظہر: یہ بے چارے تعلیم سے محروم ہیں اور کتابیں اٹھانے کی عمر میں اینٹیں اٹھا رہے ہیں۔

بلال: آپ کی بات بالکل درست ہے۔ تعلیم معاشرے کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن ہماری آدھی آبادی اس سے محروم ہے۔

اظہر: تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ جب تک اس حق کو تسلیم نہیں کیا جائے گا ہمارا معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔

بلال: آپ کے خیال میں ہماری اتنی بڑی آبادی اس بنیادی حق سے محروم کیوں ہے؟

اظہر: بلال بھائی یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ اس محرومی کی کوئی ایک وجہ نہیں بلکہ بہت سی وجوہات ہیں۔

بلال: میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن کچھ اہم وجوہات تو بیان کریں نا آپ۔

اظہر: اس محرومی میں شعور کی کمی، وسائل کی کمی، معاشی بدحالی، حکومتی عدم توجہی، بے روزگاری، تعلیم یافتہ طبقے کی ناقدری اور ملازمتوں کی عدم دستیابی زیادہ اہم ہیں۔

بلال: ماشاء اللہ! بہت گہری نظر ہے آپ کی اس موضوع پر۔

اظہر: میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہر بچے کو تعلیم دیے بغیر ملک کو ترقی یافتہ نہیں بنایا جا سکتا۔

بلال: اچھا ذرا اس بات کی وضاحت فرما دیں کہ شعور کا اس محرومی میں کیا کردار ہے؟

اظہر: تعلیم کی کمی میں سب سے زیادہ کردار شعور کی کمی کا ہے۔ والدین اس بات کا شعور ہی نہیں رکھتے کہ تعلیم ان کے بچے کے لیے کس قدر اہم ہے۔

بلال: والدین کا شعور کیا کرے جب ان کے گھر کے قریب کوئی سکول ہی نہ ہو۔

اظہر: آپ کی بات کسی حد تک درست ہے۔ اس کا حل تو صرف حکومت ہی کر سکتی ہے کہ وہ ہر علاقے میں بنیادی تعلیم کے سکول قائم کرے۔

بلال: بہت سے والدین بچوں کو پڑھانے کا شوق رکھتے ہیں لیکن معاشی مسائل کا شکار ہیں۔ اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

اظہر: غربت بھی تعلیم حاصل کرنے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس معاملے میں حکومت اور ہمارے مخیر حضرات کو مل کر کام کرنا چاہیے۔

بلال: میرے خیال میں تعلیم سے دوری کی ایک وجہ ملازمتوں کی عدم فراہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔

اظہر: میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے لوگوں میں مایوسی پھیل جاتی ہے اور وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے بجائے کام پر لگا دیتے ہیں۔

بلال: تعلیم یافتہ افراد کی ناقدری کس طرح بچوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے؟

اظہر: جب معاشرے میں تعلیم یافتہ طبقے کی ناقدری ہوتی ہے اور وہ بے روزگار پھر رہے ہوتے ہیں تو اس سے بچوں کی تعلیم میں دل چسپی کم ہو جاتی ہے جب کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی عزت اور وقار سے بچوں میں پڑھنے کا جذبہ بڑھتا ہے۔

بلال: مجھے لگتا ہے کہ غریب بچوں کی تعلیم سے محرومی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اب تعلیم دکھاوے کی چیز بن گئی ہے۔ لوگ تعلیم سے زیادہ سکول کی عمارت اور کتابوں کی جلد پر توجہ دیتے ہیں۔

اظہر: آپ کی بات درست ہے لیکن ان پرائیویٹ اداروں کی ترقی میں سرکاری اداروں کا بھی حصہ ہے۔ جب سرکاری اداروں میں پڑھائی پر کوئی توجہ نہ دی گئی تو لوگ پرائیویٹ سیکٹر کی طرف چلے گئے۔ پھر مقابلہ بازی شروع ہو گئی۔

بلال: میں تو یہ سوچتا ہوں کہ جب تک پورا معاشرہ مل کر کوشش نہیں کرے گا تب تک ''تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق'' کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔

اظہر: بالکل درست۔ حکومت نے کئی بار کوشش کی ہے اور ایسی بہت سی سکیمیں شروع کی ہیں جو اس نعرے کی تکمیل کے لیے معاون تھیں۔ لیکن معاشرے کے عدمِ تعاون کی وجہ سے وہ سکیمیں ناکام ہو گئیں۔

بلال: ہم انفرادی طور پر کس طرح اس کام میں شامل ہو سکتے ہیں؟

اظہر: جناب شاعر نے کیا خوب کہا تھا۔

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے
(احمد فراز)

ہمیں لوگوں سے ملنا چاہیے اور ان کے مسائل سن کر انھیں حوصلہ دینا چاہیے۔ انھیں تعلیم کی اہمیت کا شعور دینا چاہیے۔ انھیں احساس دلایا جائے کہ تعلیم آپ کے بچے کا بنیادی حق ہے۔

بلال: بہت شکریہ! آپ کی گفت گو سے میرے اندر جذبہ پیدا ہوا ہے۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ

اظہر: آپ کے وقت کا شکریہ! اللہ حافظ

(بلال، اظہر سے اجازت لے کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

20 دو ہم جماعتوں کے درمیان کھیلوں کے فائدے اور نقصان پر مکالمہ

(احمد تفریح کے وقت گراؤنڈ میں بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔ علی اس کے قریب آتا ہے اور ان کے درمیان گفت گو کا آغاز ہوتا ہے)

علی: السلام علیکم! کون سی دنیا میں کھوئے ہو جناب؟

احمد: وعلیکم السلام! کہیں نہیں جی، بس ایک لسٹ بنا رہا ہوں۔

علی: ایسی کون سی خاص لسٹ ہے جو اس طرح اکیلے بیٹھ کر بنا رہے ہو۔

احمد: اگلے ہفتے ہمارے علاقے میں کرکٹ لیگ ہو رہی ہے۔ اس کے لیے اپنی ٹیم فائنل کر رہا ہوں۔

علی: حد ہے یار! آپ تو ہر وقت ان فضول کاموں میں لگے رہتے ہیں۔

احمد: یہ کوئی فضول کام تو نہیں ہے۔ کھیل صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔

علی: یہ اتنا بھی ضروری نہیں جتنا کہ آپ نے اسے بنا رکھا ہے۔

احمد: لگتا ہے آپ نے وہ مقولہ نہیں پڑھا:

''صحت مند دماغ صحت مند جسم میں ہوتا ہے۔''

علی: بھائی صاحب! صحت مند دماغ کے لیے درکار صحت مند جسم تو ہلکی پھلکی ورزش سے بھی حاصل ہو سکتا۔ اس کے لیے اتنے جھمیلے کی کیا ضرورت۔

احمد: آپ کی بات بجا ہے لیکن کھیل سے صرف جسمانی صحت حاصل نہیں ہوتی، اس کے اور بھی بہت سے فائدے ہوتے ہیں۔

علی: اچھا بھئی! مجھے بھی کچھ فائدے بتائیں۔ میری نظر میں تو اس کے فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔

احمد: ہر کسی کا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے۔ کھیلوں سے جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور سماجی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

علی: بہت خوب! مجھے ذرا اس کے اخلاقی فائدے تو بتائیں۔

احمد: کھیل انسان کی اخلاقی تربیت کا ذریعہ ہیں۔ ان سے ہم مل جل کر کام کرنا سیکھتے ہیں۔

علی: زبردست! اس کے علاوہ ہمیں کون سا اخلاقی فائدہ حاصل ہوتا ہے؟

احمد: کھیل سے ہم ہار کو برداشت کرنا سیکھتے ہیں اور ہم جیت پر مناسب رویہ اختیار کرنے کا فن بھی سیکھتے ہیں۔

علی: اچھا جی! اب ذرا سماجی فائدے بھی بیان فرما دیں۔

احمد: کھیل سے ہم مخالف فریق کی عزت کرنا سیکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ تعاون کرنا بھی سیکھتے ہیں۔

علی: بہت خوب! اس کے علاوہ ہمیں کون سا سماجی فائدہ حاصل ہوتا ہے؟

احمد: جناب فائدے تو بہت سے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں کی باتوں کو صبر کے ساتھ برداشت کرنا سیکھتے ہیں۔ جب لوگ طنز کرتے ہیں تو اچھا کھلاڑی اسے حوصلے سے برداشت کرتا ہے۔

علی: بہت شکریہ! اب مجھے بھی ذرا موقع دیں اپنی بات کرنے کا۔

احمد: جی جی ضرور! آپ کے ذہن میں جو کھیل کے نقصانات ہیں وہ مجھے بتائیں۔

علی: کھیلوں کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ ان سے وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ بچے سارا سارا دن تعلیم اور کام کاج سے غافل ہو کر میدان میں کھڑے رہتے ہیں۔

احمد: آپ کی بات بالکل درست ہے۔ لیکن اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ آپ مجھے مزید نقصانات بتائیں۔

علی: سارا دن کھیلنے کے بعد بچے تھک چکے ہوتے ہیں اور کوئی کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ اس کے علاوہ کھیل کے میدان میں ہونے والے جھگڑے معاشرتی بگاڑ کا باعث بن جاتے ہیں۔

احمد: جناب آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے لیکن اس بنا پر کھیلوں کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔

علی: تو پھر کیا کرنا چاہیے؟

احمد: بھائی جان! اسلام ہمیں اعتدال کا درس دیتا ہے۔ یہی اصول کھیلوں کے لیے بھی ہے۔

علی: وہ کس طرح؟

احمد: کھیلوں کے لیے مخصوص وقت ہونا چاہیے۔ اس طرح وقت کا ضیاع بھی نہیں ہوگا اور باقی کاموں اور تعلیم کا حرج بھی نہیں ہوگا۔

علی: یہ بات تو آپ کی درست ہے۔ کھیل کے میدانوں میں ہونے والے جھگڑوں سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

احمد: اس کا حل یہ ہے کہ بڑے بھی کھیلوں کی سرپرستی کریں۔ میدان میں جب کھیل ہو تو معتبر لوگوں کی کمیٹی اس کی نگرانی کرے۔ اس طرح کھیل جھگڑے سے پاک ہو جائیں گے۔

علی: جناب آپ نے تو میرا نقطہ نظر تبدیل کر دیا۔

احمد: حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ کامیابی کے لیے ہمیں اس مقولے پر عمل کرنا چاہیے۔

"کھیل کے وقت کھیل اچھا اور کام کے وقت کام"

علی: (گھنٹی کی آواز سن کر) چلیں، لیکچر کا وقت ہو گیا ہے۔ آج وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

احمد: (لسٹ جیب میں ڈالتے ہوئے) آئیں۔ چلتے ہیں۔

(دونوں دوست کمرہ جماعت کی طرف چلے جاتے ہیں۔)

21 بجلی کی بار بار بندش (لوڈ شیڈنگ) پر دو دوستوں کے درمیان مکالمہ

(گوجرانوالہ بورڈ 2012ء، ملتان بورڈ 2009ء، سرگودھا بورڈ 2015ء، لاہور بورڈ 2018ء، سرگودھا 2018ء) (ساہیوال بورڈ، فیصل آباد بورڈ 2023ء)

(یاسر اپنے سپر سٹور پر بیٹھا ہے۔ اس کا دوست عامر اس کے پاس آتا ہے اور یوں گفتگو شروع ہوتی ہے۔)

عامر: السلام علیکم!

یاسر: وعلیکم السلام!

عامر: کیا حال ہے، آپ کا؟

یاسر: الحمدللہ! میں ٹھیک ہوں۔

عامر: سناؤ! آپ کا سپر اسٹور کیسا چل رہا ہے؟

یاسر: شکر ہے اللہ کا۔ (اتنے میں بجلی چلی جاتی ہے)

عامر: افوہ! یہ بجلی ڈھائی گھنٹے بعد تو آئی تھی اور دس منٹ بعد اب پھر چلی گئی ہے۔ گرمی سے برا حال ہو رہا ہے۔

یاسر: آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، آج کل بجلی کی لوڈ شیڈنگ بڑھ گئی ہے۔

عامر: دن میں پندرہ سے سولہ گھنٹے بجلی نہیں آتی، اتنی شدید گرمی میں بھی لوڈ شیڈنگ جاری ہے۔

یاسر: ہر جگہ بجلی کی بندش کا یہی حال ہے۔ آئے دن اخبارات اور ٹیلی وژن پر گرمی کی شدت سے اموات کی خبریں ملتی ہیں اور دل پریشان ہو جاتا ہے۔

عامر: بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے غریب لوگوں کو پنکھے کے نیچے بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔

یاسر: بجلی کی اس بار بار بندش کی وجہ سے عوام بہت پریشان ہے، رات کو سوئیں تو بجلی نہیں ہوتی اور صبح آنکھ کھلے تو بھی بجلی غائب۔

عامر: موجودہ دور میں سارے کام بجلی سے ہوتے ہیں، اگر بجلی نہ ہو تو انسان سارے کاموں کے لیے فارغ بیٹھا رہتا ہے۔

یاسر: گھریلو استعمال کے علاوہ کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں میں بھی بجلی کا استعمال ہوتا ہے۔ بجلی کی کمی سے ان میں بھی کام مکمل نہیں ہوتا۔

عامر: جب بجلی ہی نہ ہو تو کام کیسے ہو؟ فیکٹریاں، کارخانے اور ملیں بند ہو رہی ہیں اور لاکھوں لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اس سے ملک کو بہت نقصان ہو رہا ہے۔

یاسر: اس طرح عوام اپنا پیٹ بھی نہیں بھر سکتے۔ جب پیسہ ہی نہ ہو تو سکون کہاں؟

عامر: بجلی کی بار بار لوڈ شیڈنگ کے باوجود بھی بجلی کا بل بہت زیادہ آتا ہے۔

یاسر: دیکھ لو! میرے اسٹور کا بل پانچ ہزار اور گھر کا بھی اتنا ہی ہے۔ اتنے پیسے خرچ کر کے بھی بجلی نہیں ملتی۔ آخر عوام جائے تو جائے کہاں؟

عامر: بے چارے لوگوں کا جینا دوبھر ہو گیا ہے اور اس شدید گرمی میں بڑی مصیبت سے زندگی گزر رہی ہے۔ عوام پیسے ادا کر کے بھی سہولتوں سے محروم ہے کہ

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے　　جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں　　(ساغر صدیقی)

یاسر: بجلی کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں، ہر روز فی یونٹ قیمت بڑھا کر عوام پر بجلی گرا دی جاتی ہے۔

عامر: جب بجلی نہ ملے تو لوگوں کو بجلی کے لیے دوسرے ذرائع ڈھونڈنے پڑتے ہیں مثلاً یو۔ پی۔ ایس اور جنریٹر وغیرہ، اس طرح دُگنے پیسے خرچ ہوتے ہیں۔

یاسر: حکومت کو بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔

عامر: صرف حکومت سے امید رکھنا تو میرے خیال میں خام خیالی ہے۔ حکومت عوام کے مسائل سے آگاہ ہے لیکن بجلی کی پیداوار بڑھانے کے منصوبے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ان کی تکمیل میں وقت لگتا ہے۔

یاسر: یہ بھی نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں بجلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پانی بجلی پیدا کرنے کا کتنا اچھا ذریعہ ہے لیکن حکمرانوں کی اس طرف توجہ ہی نہیں ہے۔

عامر: کالا باغ ڈیم کا منصوبہ کب سے التوا میں پڑا ہے، اگر دریاؤں اور ڈیموں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے تو اس سے بجلی وافر مقدار میں پیدا ہو سکتی ہے اور عوام کو سہولت مہیا کی جا سکتی ہے۔

یاسر: لیکن ان سہولیات سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔

عامر: اگر بجلی کی لوڈ شیڈنگ اسی طرح جاری رہی تو عوام کے مسائل تو ایک طرف، کاروبار بھی بالکل ٹھپ ہو کر رہ جائیں گے۔ لوگوں کے بے روزگار ہونے کی وجہ سے ملکی معیشت تباہ ہو جائے گی۔

یاسر: حکومت کو بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خلاف کچھ کرنا چاہیے اور اس کی پیداوار میں اضافہ کرنا چاہیے۔

عامر: تم ٹھیک کہتے ہو! اللہ کرے ایسا ہو!

یاسر: اللہ آپ کی دعا قبول کرے۔

عامر: اب اجازت، میں چلتا ہوں، اللہ حافظ!

یاسر: اللہ حافظ!

(عامر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور یاسر گاہک کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔)

22 درزی اور گاہک کے درمیان مکالمہ

(درزی تیز قینچی سے کپڑے کاٹنے میں مصروف ہے۔ گاہک وہاں آتا ہے اور اونچی آواز میں مخاطب ہوتا ہے۔)

گاہک: السلام علیکم!

درزی: وعلیکم السلام! جناب تشریف رکھیں۔

گاہک: بس دو منٹ میری بات سُن لیں اور یہ کپڑا دیکھ لیں میں ذرا جلدی میں ہوں۔

درزی: سنتا ہوں جناب تسلی سے۔ آپ اتنے عرصے بعد آتے ہیں ہمارے پاس۔ سب خیریت تو رہی ہے ناں۔

گاہک: جی جی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔ ہر طرح سے خیریت ہے۔ کچھ مصروفیات تھیں اور کچھ حالات نے آنے کا موقع نہیں دیا۔

درزی: کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ بھلا آپ کے حالات کو کیا ہوا ہے؟

گاہک: جناب! اس مہنگائی نے حالات اتنے مشکل کر دیے ہیں کہ نیا سوٹ خریدنے کی سکت نہیں رہی۔

درزی: آپ کو مہنگائی سے کیا فرق پڑتا ہے جی۔ آپ کی تو ماشاء اللہ اتنی اچھی ملازمت ہے۔

گاہک: ملازمت تو الحمدللہ بہت اچھی ہے لیکن مسائل اس سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں، لگتا ہے شاعر نے میرے بارے میں ہی کہا تھا۔

کس ضرورت کو دباؤں، کسے پورا کرلوں
اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے (نصرت صدیقی)

درزی: واہ وا! آپ تو سخن شناس نکلے۔

گاہک: جی بالکل، دل سے نکلی ہوئی بات اثر تو رکھتی ہے نا۔

درزی: جناب باتوں باتوں میں یہ تو پوچھنا بھول ہی گیا، آپ چائے پسند فرمائیں گے یا بوتل۔

گاہک: تکلف کی کوئی ضرورت نہیں جی۔ آپ بس ناپ لیجیے اور اجازت دیجیے۔

درزی: اس میں تکلف والی کوئی بات نہیں۔ آپ اپنی پسند بتا دیں۔ میں آپ کے سوٹ کا ناپ چیک کر لیتا ہوں۔

گاہک: اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو پھر چائے منگوا لیجیے۔

درزی: شکریہ جناب! (کاپی میں دیکھتے ہوئے) یہ لیں جی آپ کا پہلے والا ناپ مل گیا ہے۔ اسی کے مطابق سینا ہے یا کچھ تبدیل کرنا ہے۔

گاہک: تبدیل کیا کرنا ہے۔ اب کون سا ہمارا قد بڑھ گیا ہے۔

درزی: (کپڑا اٹھا کر دیکھتے ہوئے) کپڑا تو بہت اچھا پسند کیا ہے آپ نے۔ سلائی ڈبل کرنی ہے یا سنگل؟

گاہک: ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

درزی: سنگل کی سلائی پندرہ سو روپے ہے اور ڈبل کی اٹھارہ سو روپے ہے۔

گاہک: ہم مہنگائی کے ماروں کا کچھ تو خیال کریں۔

درزی: جناب! ہم تو اپنے گاہکوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ لیکن سامان اور بجلی کی قیمتیں ہی اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔

گاہک: آپ کی بات بجا ہے لیکن میں ڈبل سلائی کے سولہ سو روپے دوں گا۔

درزی: آپ ہمارے پرانے گاہک ہیں۔ اب آپ سے کیا بحث کرنی۔ جیسے آپ کو مناسب لگے۔

گاہک: آپ کی محبت کا شکریہ۔ اچھا اس بار جیبیں قمیص کے دونوں طرف پر لگانی ہیں۔ پچھلی بار آپ نے ایک لگا دی تھی۔

درزی: بے فکر رہیں جی آپ۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

گاہک: بہت مہربانی آپ کی۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔

درزی: آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔

گاہک: (دکان سے نکلتے ہوئے) اللہ حافظ

درزی: اللہ حافظ

(گاہک کپڑے دے کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور درزی اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔)

اضافی اہم مکالمہ جات

بمطابق سابقہ بورڈ پیپرز

23 دو طالب علموں کے درمیان احترامِ استاد پر مکالمہ

(فیصل آباد بورڈ 2012ء)

(شعیب اور عمیر ہم جماعت ہیں۔ تفریح کا وقت ہے۔ اچانک دالان میں دو طالب علم آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔ پروفیسر محمد سلیم صاحب انھیں لڑنے سے منع کرتے ہیں لیکن ایک طالب علم ان سے بدتمیزی سے پیش آتا ہے۔ اس پر شعیب حیران ہو کر عمیر سے کہتا ہے۔)

شعیب: عمیر! دیکھ رہے ہو کہ ایک عظیم ہستی سے کتنا اوچھا رویہ برتا جا رہا ہے۔

عمیر: شعیب! یہ کوئی نئی بات نہیں۔ آج ہمارے معاشرے سے اساتذہ کا احترام اٹھ چکا ہے۔

شعیب: دیکھو! یہ کوئی طریقہ تو نہیں ہے استاد سے گفتگو کا۔ باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب کے مصداق یہ طلبہ کیا حاصل کریں گے۔

عمیر: اساتذہ کی بے ادبی کرنے والے طلبہ میں سے، میں نے اکثر کو دھکے ہی کھاتے دیکھا ہے۔

شعیب: اُستاد تو وہ ہستی ہے کہ جس سے نیا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ جیسا کہ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بیٹا! استاد کا احترام کرو کہ یہ وہ ہستی ہے جس نے مستقبل تشکیل دینا ہے۔

عمیر: حضرت امیر خسروؒ نے فرمایا تھا کہ:

توں آں شاہی کہ بر ایوانِ قصرت کبوتر گر نشیند، باز گردد

(ترجمہ: (اے استادِ محترم!) آپ وہ شہنشاہ ہیں کہ آپ کے محل پر اگر کبوتر آ کر بیٹھ جائے تو جب وہ اُڑے گا، کبوتر نہیں ہوگا بلکہ باز ہوگا۔)

شعیب: اساتذہ کا تو وہ مقدس پیشہ ہے کہ جس کے متعلق حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''انما بُعِثتُ معلما'' ترجمہ: ''بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے'' (ابن ماجہ)

عمیر: کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں استاد کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے بادشاہ اور شہزادے اپنے استادوں کے جوتے سیدھے کیا کرتے تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دونوں بیٹے امین اور مامون اپنے استاد کے جوتے اٹھانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

شعیب: شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ بھی اپنے استاد کا بڑا احترام کیا کرتے تھے اور انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

عمیر: ماضی و حال کے شاگرد کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ساری زندگی اپنے استاد کے گھر کی طرف پاؤں نہیں پھیلائے۔ حضرت علیؓ عظیم شخصیت اور اسلامی سلطنت کے خلیفہ ہیں، لیکن یہودی کو دیکھ کر کہ جس سے ایک لفظ پوچھا تھا کھڑے ہوجاتے ہیں اور آج افسوس کہ طلبہ اساتذہ کے سامنے زبان دراز ہیں۔

شعیب: استاد ہمیں لکھنا پڑھنا ہی نہیں سکھاتے بلکہ زندگی کو سمجھنے کا شعور بھی دیتے ہیں۔ ہمیں اچھے اخلاق سکھاتے اور اچھا انسان بناتے ہیں۔

عمیر: تم نے ٹھیک کہا۔ یہ کتابیں اور نصاب ہمیں معلومات دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں اچھا انسان تو استاد ہی بناتے ہیں۔ تم نے اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر نہیں سنا؟

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں   آدمی، آدمی بناتے ہیں

شعیب: استاد تو وہ ہستی ہوتی ہے جو اپنے سینے میں چھپا علم طالب علم کے حوالے کرتی ہے۔

عمیر: دوست! لیکن سو برائیوں سے بڑھ کر ایک برائی ہمارے معاشرے میں پھیل چکی ہے اور وہ ہے اساتذہ کی ناقدری۔

شعیب: کچھ طلبہ اساتذہ کی ڈانٹ سن کر طیش میں آجاتے ہیں۔

عمیر: اساتذہ کی ڈانٹ بھی ہمارے لیے مفید ہوتی ہے۔ وہ تو ہماری ہی بہتری کے لیے سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن نظر غائر سے دیکھا جائے تو سخت الفاظ ہمارے لیے کہیں زیادہ مفید ہوتے ہیں۔

شعیب: لیکن آج کے طلبہ اساتذہ کے احترام کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے اور یہ ایک ایسا گھٹیا فعل ہے جو طلبہ کے اخلاق کو برباد کر دیتا ہے۔

عمیر: شعیب! سکندر اعظم کا نام سُنا ہوگا۔ دنیا کا فاتح تھا لیکن پھر بھی استاد کے سامنے یوں مؤدب ہوتا تھا جیسے خوف سے سہما ہوا ہو۔ وہ اپنے استاد ارسطو کے متعلق کہتا تھا۔

"میرا باپ (فلپ) مجھے آسماں سے زمیں پر لایا اور میرا اُستاد (ارسطو) مجھے زمین سے آسماں پر لے گیا"

شعیب: لیکن بدقسمتی سے یہ رسمِ ادب ہمارے معاشرے سے اُٹھ گئی ہے اور میرے خیال میں زوالِ معاشرہ میں اس کا بنیادی کردار ہے۔

عمیر: مہذب قومیں تو اب بھی اپنے اساتذہ کا احترام کرتی ہیں، جو لوگ دوسرے ممالک سے ہو کر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان معاشروں میں استاد کو سب سے زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دفتروں میں، بسوں میں، عوامی مقامات پر ہر جگہ استاد کو ترجیح دی جاتی ہے۔

شعیب: ہاں یار! وہاں تو صرف شاگرد ہی اپنے استاد کا احترام نہیں کرتے بلکہ سارا معاشرہ اساتذہ کا بہت احترام کرتا ہے۔

عمیر: آپ نے بالکل بجا فرمایا ہے، جن معاشروں میں استاد کا احترام کیا جاتا ہے اور شاگرد بھی اپنے اساتذہ کا احترام کرتے ہیں، وہ معاشرے ترقی ضرور کرتے ہیں۔

ادب تعلیم کا جوہر ہے، زیور ہے جوانی کا   وہی شاگرد ہیں جو خدمتِ استاد کرتے ہیں (چکبست برج نرائن)

شعیب: آخر ہمارے ہاں استاد کا احترام کیوں کم ہوتا جا رہا ہے؟

عمیر: اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ناجائز دولت، نااہل لوگوں کا بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جانا، دین سے دوری اور مادہ پرستی وغیرہ اس کی چند اہم وجوہات ہیں۔

شعیب: پتا نہیں! آج کل کے طلبہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ شاید وہ اساتذہ کے مقام سے واقف نہیں ہیں۔

عمیر: واقف تو خوب ہیں لیکن بعض اداروں میں خود اعتمادی (Confidence) کی آڑ میں انھیں زبان دراز کیا جاتا ہے۔

شعیب: بس! خدا ہمارے نوجوانوں کو عقل دے اور انھیں احترامِ اساتذہ کی توفیق دے۔

عمیر: آمین

(وقفہ کے اختتام کی گھنٹی بجتی ہے تو دونوں دوست اپنی جماعت کے کمرے کی طرف چل پڑتے ہیں۔)

24 دو طالب علموں کے درمیان مطالعہ کتب کی اہمیت پر مکالمہ

دو طالب علموں کے درمیان مطالعہ کتب کی اہمیت پر مکالمہ

(طارق کالج کے صحن میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ سامنے سے خالد آتا دکھائی دیتا ہے۔ خالد کے ہاتھ میں کتاب ہے۔ خالد طارق کے پاس آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

خالد: السلام علیکم!

طارق: وعلیکم السلام! یہ تمھارے ہاتھ میں کون سی کتاب ہے؟

خالد: ابھی ابھی لائبریری سے "نامور مسلم ہیروز" نامی تاریخی کتاب لے کر آیا ہوں۔

طارق: تاریخی کتاب! یہ کون سا وقت ہے تاریخی کتب کے مطالعے کا؟ ایف۔ ایس۔ سی کے لیے تیاری کا اہم وقت یوں ضائع کر رہے ہو؟

خالد: میں ان کتب سے اضافی وقت میں مستفید ہوتا ہوں۔ پہلے نصابی کتابوں کو پڑھتا ہوں اور فارغ وقت میں تاریخی کتب کا مطالعہ کرتا ہوں۔

طارق: لیکن اس سے تو تمھاری پڑھائی کا نقصان ہوتا ہوگا۔

خالد: بالکل نہیں۔

طارق: یہ کیسے ممکن ہے؟

خالد: دیکھو! بھئی صرف نصابی کتابوں کا بار بار مطالعہ کر کے بھی انسان کو تھکاوٹ اور بوریت سی محسوس ہوتی ہے۔

طارق: لیکن کتاب چھوڑ کر کتاب ہی پڑھنے سے کیسے تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے؟

خالد: تاریخی کتب کا مطالعہ میں بڑے ذوق و شوق سے کرتا ہوں۔ اس لیے تاریخی کتابیں پڑھتے ہوئے مجھے بوریت نہیں ہوتی۔ فارغ وقت میں تمھارا کیا معمول ہے؟

طارق: میں تو روزانہ عصر سے مغرب تک کرکٹ کھیلتا ہوں۔ انسان تازہ دم بھی ہو جاتا ہے اور پڑھائی سے پیدا ہونے والی تھکاوٹ بھی دور ہو جاتی ہے۔

خالد: تو کیا یہ وقت کا ضیاع نہیں؟

طارق: نہیں! کیوں کہ صحت کی خاطر یہ بھی ضروری ہے۔

خالد: میں تو اپنے اضافی وقت کو کتابوں کے مطالعہ میں صَرف کرتا ہوں اور ورزش کے طور پر روزانہ صبح سویرے سیر کرتا ہوں۔

طارق: روزانہ ورزش کرنے کا معمول تو اچھا ہے۔ لیکن غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

خالد: غیر نصابی کتب کے مطالعہ سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

طارق: کیسے فوائد؟

خالد: اس سے ہمارے علم و فہم میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور زندگی میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔

طارق: غیر نصابی کتابیں پڑھنے سے اور کیا فائدہ ہوتا ہے؟

خالد: تاریخی کتب کے مطالعہ سے قدیم دور کے حالات و واقعات سے واقفیت ہوتی ہے۔ انسان تاریخ سے متعلق حقائق سے بھی واقف ہوتا ہے۔ کتابیں انسان کو گھر بیٹھے دنیا کی سیر کرا دیتی ہیں۔ اس طرح انسان کے لیے یہ فرحتِ طبع کا باعث بنتی ہیں۔

طارق: کیا ان کے مطالعے سے تمھیں اکتاہٹ نہیں ہوتی؟

خالد: بالکل نہیں۔ یہ تو ایسی چیز ہے کہ بقول شاعر:

ہم نشینی اگر کتاب سے ہو   اس سے بہتر کوئی رفیق نہیں

طارق: ہمیں امتحان میں بھی ان کے مطالعہ سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے؟

خالد: یقیناً خاص طور پر اُردو، اسلامیات اور مطالعہ پاکستان جیسے مضامین کے لیے ان کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ اس کے علاوہ معلومات میں

اضافہ ہوتا ہے اور اب تو انٹری ٹیسٹ میں جنرل نالج ٹیسٹ، اپٹی ٹیوڈ ٹیسٹ بھی شامل کر دیا ہے۔ جن میں یہ علم نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے۔

طارق: اس لحاظ سے تو میں بھی ان کُتب کے فائدے کو تسلیم کرتا ہوں۔

خالد: اور خاص طور پر یہ علم تعمیرِ کردار میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا

"علم تعمیرِ کردار کے لیے ناگزیر ہے۔"

اس کے علاوہ مضمون نویسی، مباحثہ اور تقریری مقابلوں میں بھی اضافی مطالعہ کافی فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

طارق: تمھاری بات بالکل درست ہے۔ اب میں بھی اضافی وقت میں کھیل کی بجائے مطالعۂ کتب کو ترجیح دوں گا۔

خالد: شکریہ طارق، اللہ تعالیٰ تمھارے علم میں اضافہ فرمائے۔

طارق: آمین۔ اب ہمیں چلنا چاہیے کیوں کہ اُردو کا لیکچر شروع ہوا چاہتا ہے۔

خالد: چلو کلاس میں چلتے ہیں۔

(دونوں دوست جماعت کے کمرے کی طرف چل پڑتے ہیں۔)

25 دو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے درمیان بے روزگاری کے عنوان پر مکالمہ

(راولپنڈی 2014، لاہور 2010، 17، ملتان 13، سرگودھا 12، لاہور 2016، گوجرانوالہ بورڈ 18، فیصل آباد بورڈ 18)

(اسٹیشن پر ابھی گاڑی ٹھہری ہوئی ہے۔ ڈبہ نمبر 12 میں ایک نوجوان جس کے چہرے سے خستہ حالی عیاں ہے سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اتنے میں ایک اور نوجوان اس کے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور گفتگو شروع ہوتی ہے۔)

نوجوان: السلامُ علیکم!

نووارد: وعلیکم السلام!

نوجوان: کیا نام ہے آپ کا؟

نووارد: میرا نام اسد ہے۔ آپ اپنا تعارف کرانا پسند کریں گے؟

نوجوان: میرا نام عمر ہے۔ (ایک سرد اور لمبی آہ بھرتے ہوئے) ایک مرتبہ پھر قسمت آزمانے کے لیے چل پڑا ہوں۔ پرسوں کے روزنامہ نوائے وقت میں پڑھا تھا کہ الفلاح بینک کو چند کیشیئر درکار ہیں۔

نووارد: (حیران ہوتے ہوئے) اس کا مطلب ہے ہماری منزل ایک ہی ہے۔ میرا نام اسد ہے۔ میں بھی نوکری کی تلاش میں ہوں۔

عمر: کیا تعلیم ہے آپ کی؟

اسد: ایم۔کام۔ کیے دو سال گزر چکے ہیں۔ آئے دن نوکری کے ارمان لیے گھر سے نکلتا ہوں۔ مگر شام کو ناکام لوٹ آتا ہوں۔

عمر: نوکری ملنا تو دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ میں بھی مسلسل تین برس سے نوکری کا تلاش کر رہا ہوں مگر ایک شاعر نے شاید میری حالت کی نقشہ آرائی کی ہے:

تری خاطر ہر روز صحرا نوردی کرتا ہوں — پیاسا ہوں اب تک، ملا نہیں جامِ دیدار

اسد: ہمارے ملک میں بھی عجب دستور ہے۔ جس قدر شرحِ تعلیم میں اضافہ ہو رہا ہے، ملازمتیں نایاب اور بے روزگاری میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

عمر: پہلے تو یہ سُنتے تھے کہ فقط ان پڑھ ہی بے روزگار ہوتے ہیں۔ مگر یہ تلخ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں تعلیم یافتہ ہی زیادہ تر بے روزگاری کا شکار ہیں۔

اسد: ہاں! کیوں کہ ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ کی اکثریت کاروبار اختیار کر لیتی ہے اور ہم جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ برسہا برس نوکری حاصل کرنے کے بکھیڑوں میں الجھے رہتے ہیں۔

عمر: اس بے روزگاری کی کئی وجوہ ہیں۔ اولین وجہ تو سرمایہ داروں کی اجارہ داری ہے۔ کسی دور میں ہم کہتے تھے کہ

"جان ہے تو جہان ہے" لیکن ابوالکلام آزاد نے کیا خوب کہا تھا: "زر ہے تو جہان ہے"

اسد: ہاں یہ تو ہے۔ پیسے نہ ہوں تو ڈگری کو کون پوچھتا ہے۔ پھر اس سے دُہرا نقصان ہوتا ہے۔ ایک طرف نالائق عہدے دار تو دوسری طرف حق تلفی۔

عمر: اس کے ذمہ دار معمر حضرات بھی ہیں۔ ان لوگوں کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر جاتی ہے مگر ملازمت سے چمٹے رہتے ہیں۔ نتیجتاً نوجوان نسل کی بُری طرح حق تلفی ہو رہی ہے۔

اسد: ایک اور بڑی وجہ سفارش ہے۔ آج کل نوکری کے لیے پیسہ ہو یا سفارش۔ ورنہ نتیجہ مایوسی نکلتا ہے۔

عمر: ان حالات میں تعلیم یافتہ نوجوان انتہائی مایوس ہو کر رہ جاتے ہیں اور خاص طور پر جن والدین نے اپنی اولاد کو بڑے کٹھن اور مشکل حالات میں تعلیم دلائی ہوتی ہے، جب ان کی اولاد کو ملازمت نہیں ملتی تو اُن کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

اسد: میرے والد کی بھی یہی حالت ہے۔ وہ ایک مستری ہیں دن رات محنت مشقت کر کے انھوں نے مجھے پڑھایا اور آج بڑھاپے میں وہ میری بے بسی کا منظر دیکھ رہے ہیں۔

عمر: نوکریوں کی اس غیر منصفانہ تقسیم نے پاکستان کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ یہاں تو نسل در نسل نوکریوں کا سلسلہ ہے۔

اسد: آپ کوئی بھی روزنامہ اُٹھا لیجیے "اسامیاں خالی ہیں" کی ایک لمبی فہرست نظر آئے گی لیکن انٹرویو دینے کے بعد پتا چلتا ہے کہ یہ صرف دکھاوا تھا۔ ملازمتیں پیسے یا سفارش کی بنیاد پر پہلے ہی ہو چکی ہوتی ہیں۔

عمر: پاکستانی حکومت کو چاہیے کہ اس بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے خلاف قدم اٹھائے ورنہ بدترین نتائج برآمد ہوں گے۔

اسد: اس طرح کی حالت مجھے مایوس کر دیتی ہے لیکن پھر **لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ** (سورۃ الزمر: 53) کے تحت امید باقی ہے۔ اور **اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ** (سورۃ البقرہ: 153) کو مدِ نظر رکھ کر صبر کا دامن تھامے ہوئے ہوں۔

عمر: اگر اہل لوگوں کو ملازمتیں ملیں گی تو ملک روبہ زوال ہونے کی بجائے ترقی کی طرف گامزن ہوگا۔

اسد: میں بھی آج امید کا دامن تھامے گھر سے نکلا ہوں۔

(چند لمحوں کے بعد گاڑی لاہور اسٹیشن پر رُکتی ہے اور دونوں پلیٹ فارم پر اترتے ہیں۔)

عمر: خدا کرے آج ہمارے والدین کی دعائیں قبول ہو جائیں۔

اسد: آمین۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔

(دونوں دوست اسٹیشن سے نکل کر اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں)

26 دو دوستوں کے درمیان امتحانی نظام / نظامِ تعلیم کے موضوع پر مکالمہ

(بہاول پور بورڈ 14-2010-2005، فیصل آباد 2005، سرگودھا 2010، آزاد کشمیر 2005، سرگودھا 2015، ملتان بورڈ 18، لاہور، گوجرانوالہ 2015)

(عبدالہادی اور عبدالرافع دو دوست ہیں۔ حمزہ لنک روڈ پر جا رہا ہے، اتنے میں اسے سامنے سے عبدالرافع آتا دکھائی دیتا ہے۔ دونوں میں سلسلہ کلام کچھ یوں شروع ہوتا ہے)

عبدالرافع: السلام علیکم!

عبدالہادی: وعلیکم السلام!

عبدالرافع: خیریت تو ہے بڑی مدت بعد درشن ہوئے ہیں؟

عبدالہادی: (روکھے سے انداز میں) بس خیریت ہی سمجھو۔

عبدالرافع: کچھ تو بتاؤ کہ یہ حالات کا خاموش شکوہ کیوں ہے؟

عبدالہادی: بس یار امتحانی نظام / تعلیمی نظام کے حالات کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں۔

عبدالرافع: کیوں! نظامِ تعلیم نے تمھارا کیا بگاڑ دیا ہے؟

عبدالہادی: میرا کیا بگاڑا، بلکہ پوری قوم ہی پریشان ہے۔

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری (علامہ محمد اقبالؒ)

عبدالرافع: یار تم صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟

عبدالبادی: بس یار! سالِ اوّل کے پرچے دیے تھے اور بائیولوجی کا پرچہ ہوا بھی اچھا تھا لیکن نتیجہ آیا تو پتا چلا کہ بائیولوجی میں صرف 35 نمبرز ہیں۔ ری چیک کرایا تو پتا چلا کہ ممتحن نے دو سوال آٹھ آٹھ نمبر کے کاٹ دیے ہیں۔

عبدالرافع: کیوں، کیا وجہ؟

عبدالبادی: محض تفریحِ طبع کی خاطر یا شاید چیک کرتے وقت ممتحن محوِ خواب تھا۔

عبدالرافع: تو تم نے بورڈ والوں سے کہا نہیں؟

عبدالبادی: کیا ہوتا ہے کہنے سے؟ کہنے لگے بس دیکھ لو نمبر صفر لگے ہیں نا۔ بس ٹھیک ہے۔

عبدالرافع: یہ تو زیادتی ہے۔

عبدالبادی: یار! یہ کوئی طریقہ تو نہیں کہ ممتحن من مانی کرتے رہیں اور طلبہ کی محنت کو غارت کر دیں۔ ستم تو یہ ہے کہ کوئی ان کے خلاف قانونی کارروائی بھی نہیں کر سکتا۔

عبدالرافع: اور اساتذہ کی تقسیم میں بھی ناانصافی کی جاتی ہے۔ بڑے شہروں میں تجربہ کار اور نامور اساتذہ ہوتے ہیں جب کہ پسماندہ علاقوں میں اساتذہ کی کمی۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ میڈیکل کالجز اور انجینئرنگ یونی ورسٹیوں میں بڑے شہروں کے طلبہ ہی داخلہ لینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

عبدالبادی: چھوٹے شہروں کے تعلیمی اداروں کی ناقص عمارتیں ہوتی ہیں، جب کہ گاؤں اور دیہاتوں میں تو یہ سہولتیں بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسی فیصد زمینداروں کے بیٹے بھی زمیندار ہی بنتے ہیں۔

عبدالرافع: پاکستان کو آزاد ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں لیکن افسوس کہ، آج تک تعلیم جیسا بنیادی شعبہ ملک میں مفلوج ہے۔

عبدالبادی: یہی نہیں بلکہ جو تعلیم دی جاتی ہے وہ محض نظریاتی ہو کر رہ گئی ہے۔

عبدالرافع: وہ کیسے؟

عبدالبادی: دیکھو بھئی! سائنس کا شعبہ ہی لے لو، طلبہ تمام تر نظریات یا تھیوریز، مشاہدات، ڈی ڈکشن اور قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن انھیں عملی زندگی میں لاگو نہیں کر پاتے اور اس سے ترقی کی راہیں ہموار نہیں ہوتیں۔

عبدالرافع: کیوں کہ ہمارے ہاں تعلیم کا اصل مقصد صرف نوکری کا حصول یا بڑے عہدے تک پہنچنے کی راہیں ہموار کرنا ہے اور ویسے بھی یہ کام تو سائنس دانوں کا ہے۔

عبدالبادی: نہیں قطعاً نہیں۔ تحقیق صرف سائنس دانوں ہی کا کام نہیں بلکہ ایک طالب علم حقیقت میں محقق ہوتا ہے، نہ کہ صرف رٹنے والا۔

عبدالرافع: اور شاید یہی اصول اسلامیات میں ہے۔ ہم نے تمام اسلامی قوانین، اسوہ حسنہ ﷺ، صداقت، شرافت کے متعلق قرآنی احکامات پڑھے ہیں۔ لیکن عملی زندگی میں اس کا نفاذ نہیں کرتے۔

عبدالبادی: اس کی وجہ کیا ہے۔ جانتے ہو؟

عبدالرافع: نہیں!

عبدالبادی: پاکستان تو آزاد ہو گیا لیکن نظامِ تعلیم آزاد نہ ہو سکا۔ نظامِ تعلیم اور امتحانی نظام آج بھی انگریزوں کے دور کے ہیں، جو لارڈ میکالے لایا تھا جس نے کہا تھا۔

''مجھے ایسا نظام تشکیل دینے کے لیے بھیجا گیا ہے جس کا مقصد کلرکوں کی پیداوار ہے''۔

اور شاید اسی لیے اکبر الٰہ آبادی نے کہا:

نئی تعلیم میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے — مگر یوں ہی کہ جیسے آبِ زم زم میں داخل ہے

مساجد سنسان ہیں اور کالجوں میں دھوم ہے — مسئلہ قومی ترقی کا مجھے معلوم ہے

عبدالرافع: محکمہ تعلیم کو چاہیے کہ تعلیمی اصلاحات نافذ کرے اور امتحانات کی چیکنگ کا نظام درست کیا جائے۔ تاکہ طلبہ کی حق تلفی نہ ہو سکے۔ اس طرح ملکی معیشت بھی مستحکم ہو گی اور ملک ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکے گا۔

عبدالبادی: (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا! بس اب چلتے ہیں دیر ہو رہی ہے۔ اللہ حافظ

عبدالرافع: اچھا! اللہ حافظ

(دونوں دوست مخالف سمت میں چل پڑتے ہیں)

27 دو سہیلیوں/دوستوں کے درمیان مہنگائی کے موضوع پر مکالمہ

(سرگودھا بورڈ 2012ء، بہاول پور بورڈ 18-2008-12، ملتان 17-14-2006، گوجرانوالہ 15-12-2007، لاہور، آزاد کشمیر، فیڈرل بورڈ 16، ڈیرہ غازی خان بورڈ 18، راولپنڈی بورڈ 18، لاہور، سرگودھا 2018 گوجرانوالہ، ملتان 2019) (ملتان بورڈ، ساہیوال بورڈ 2023)

(وحیدہ اور شکیلہ دونوں سہیلیاں ہیں اور ایک ہی محلّہ میں رہتی ہیں۔ وحیدہ، شکیلہ سے ملنے کے لیے اس کے گھر آتی ہے اور دونوں میں سلسلہ کلام کا آغاز ہوتا ہے۔)

وحیدہ: السلام علیکم! شکیلہ کیسی ہو؟

شکیلہ: وعلیکم السلام! بس ٹھیک ہوں۔

وحیدہ: خیریت ہے بہن؟ کیوں سر پکڑے بیٹھی ہو؟

شکیلہ: یہ دیکھو آج ہی بجلی کا بل آیا ہے اور وہ بھی پانچ ہزار روپے۔

وحیدہ: تو آپ بجلی کا استعمال کم کیا کریں ناں۔

شکیلہ: بہن! آپ تو کمال کی باتیں کر رہی ہیں۔ میں نے کون سا گھر میں ایئر کنڈیشنر لگوا رکھا ہے۔ صرف دو انرجی سیور اور ایک پنکھا چلتا ہے۔

وحیدہ: دراصل آج کل بجلی کی قیمتیں بھی آسمان کو چھو رہی ہیں۔ ہر دوسرے روز فی یونٹ قیمت بڑھا کر عوام پر بجلی گرا دی جاتی ہے۔

شکیلہ: ابھی تو صرف بجلی کا بل آیا ہے اس کے بعد سوئی گیس کا بل اور پھر ٹیلی فون کا بل، بلوں کی بھرمار ہے۔ شاید اسی لیے انور مسعود نے کہا تھا:

جو چوٹ بھی لگی ہے وہ پہلی سے بڑھ کے تھی — ہر ضربِ کرب ناک پہ میں تلملا اُٹھا

پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا — بل اتنے مل گئے ہیں کہ میں بلبلا اُٹھا

وحیدہ: واہ بھئی! سخن شناس ہو گئی ہو۔

شکیلہ: بہن! بے بسی، ظلم، ناانصافی انسان کو زبان دے دیتے ہیں۔ آج مہنگائی گلا گھونٹ رہی ہے۔

وحیدہ: مہنگائی سے صرف آپ ہی نہیں بلکہ پورا ملک پریشان ہے۔

شکیلہ: میاں کے کاروبار کی یہ حالت ہے کہ روز بروز زوبہ زوال ہے۔ صبح سے رات گئے تک دکان پر بندھے رہتے ہیں۔ مشکل سے بیس پچیس ہزار ماہانہ آمدنی ہے۔ صرف بجلی کا بل ہی تین ہزار روپے ہے پھر گیس کا بل اور دیگر اخراجات الگ ہیں۔

وحیدہ: جی ہاں! مہنگائی کا تو یہ عالم ہے کہ تین سو روپے کلو چنے ملتے ہیں۔ گوشت تو کجا اب تو عوام کے منہ سے سوکھے ٹکڑے بھی چھینے جا رہے ہیں۔

شکیلہ: دیکھو بہن! میرے تین بچے سکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ آٹھ سو روپے ماہانہ ان کی فیس ہے۔ پھر ان کے دیگر اخراجات الگ ہیں۔ الغرض اب تو دو وقت کی روٹی ملنا بھی دشوار ہو رہی ہے۔

وحیدہ: مہنگائی نے تو خاص طور پر غریبوں کی کمر توڑ دی ہے۔ پاکستان کی اکثریت غربت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

شکیلہ: موجودہ حکومت نے کئی ٹیکس عائد کر دیے ہیں جس کی وجہ سے مہنگائی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ حالاں کہ حکومت کو چاہیے کہ مہنگائی کے سدِ باب کے لیے کوشش کرے۔

وحیدہ: حکومت کو چاہیے کہ عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ ڈالنے کی بجائے اپنے غیر ضروری اخراجات میں کمی کرے۔ اور عوام کو سہولیات فراہم کرے۔

شکیلہ: حکمرانوں کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے میڈیا کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

وحیدہ: دراصل منافع خوروں، ذخیرہ اندوزوں کی وجہ سے بھی مہنگائی میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ لوگ من مانی کرتے ہوئے چیزیں مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔

شکیلہ: میں تو ہر وقت پریشان رہتی ہوں۔ پتا نہیں یہ مہنگائی کا سیلاب ہمیں کہاں پہنچا کر دم لے گا۔
وحیدہ: یہ تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا سدِ باب کرے، کیوں کہ جس ملک میں مہنگائی دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے اس ملک کی ترقی ناپید ہو جاتی ہے۔
شکیلہ: واقعی مہنگائی نے تو خوش حال زندگی کو ناممکن بنا دیا ہے۔
وحیدہ: ہر شخص حصولِ زر کی دوڑ میں سرگرداں ہے۔ ہر کوئی راتوں رات امیر بننا چاہتا ہے، جس کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل جنم لے رہے ہیں۔
شکیلہ: قناعت کی دولت سے تو ہمارا معاشرہ تہی دامن ہو گیا ہے۔
وحیدہ: دراصل مہنگائی کو بڑھانے میں ہمارا بھی عمل دخل ہے۔ ہم فضول خرچی سے کام لیتے ہیں۔ شادی بیاہ کے مواقع ہوں یا کوئی اور موقع، بے جا خریداری کرتے ہیں۔
شکیلہ: تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن جو لوگ اخراجات میں احتیاط سے کام لیتے ہیں ان کے لیے بھی تو زندگی دوبھر ہو گئی ہے۔
وحیدہ: ہمیں چاہیے کہ ہم بھی مہنگائی کا بھرپور مقابلہ کریں۔
شکیلہ: وہ کیسے؟
وحیدہ: ہمیں چاہیے کہ ہم روزمرہ کے معمولات میں سادگی کو رواج دیں اور کفایت شعاری سے کام لیں، قناعت اور توکل کا دامن تھامیں۔
شکیلہ: ہاں! اس دور میں تو واقعی اس کی سخت ضرورت ہے۔
وحیدہ: میں تو دعا ہی کر سکتی ہوں۔ اچھا بہن میں چلتی ہوں آپ کے بھائی صاحب کے گھر آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اللہ حافظ
شکیلہ: ٹھیک ہے، بہن، اللہ حافظ

(وحیدہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے)

28 دو طالبات کے درمیان فیشن پرستی کے موضوع پر مکالمہ

(گوجرانوالہ 2009ء، ملتان بورڈ 17) (فیصل آباد بورڈ 2023)

(کالج میں الوداعی پارٹی ہے۔ میمونہ بے چینی سے اپنی سہیلی ماریہ کی منتظر ہے۔ طویل انتظار کے بعد ماریہ دروازے پر نمودار ہوتی ہے اور دونوں میں سلسلہ کلام یوں شروع ہوتا ہے۔)

ماریہ: السلام علیکم!
میمونہ: وعلیکم السلام! خیریت تو تھی اتنی دیر کیوں لگا دی؟
ماریہ: بس ذرا تیاری میں دیر لگ گئی۔ بیوٹی پارلر میں کافی بھیڑ تھی۔
میمونہ: (حیرت و استعجاب کے ملے جلے جذبات سے تقریباً چیختے ہوئے) کیا؟ تم بیوٹی پارلر گئی تھی؟
ماریہ: ہاں تو اس میں کیا حرج ہے؟
میمونہ: ایک معمولی سے فنکشن کے لیے تم نے وقت اور پیسے کا ضیاع کیا۔ کتنا خرچ ہوا تمھارا اس پارٹی کی تیاری میں؟
ماریہ: دو ہزار روپے تو بیوٹی پارلر پر ادا کیے اور تقریباً آٹھ ہزار روپے کے جوتے اور کپڑے وغیرہ خریدے۔
میمونہ: (جوتوں کی طرف دیکھتے ہوئے اور کپڑوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے) افسوس! تم نے صرف اس عام سی تقریب کے لیے والدین کے لیے مصیبت پیدا کی۔
ماریہ: میمونہ! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ہم قرونِ وسطیٰ میں نہیں بلکہ اکیسویں صدی کے جدید ترین زمانے میں رہ رہے ہیں۔ فیشن کا زمانہ ہے۔ کچھ زمانے کے ساتھ بھی چلنا پڑتا ہے۔
میمونہ: تم ایک آزاد خیال لڑکی ہو، فضول چیزوں پر اتنا روپیا خرچ کر دیا۔
ماریہ: پیسوں کی فکر چھوڑو۔ اس سے انسان میں خود اعتمادی اور انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔
میمونہ: ماریہ! یہ تمھاری خام خیالی ہے جسے تم خود اعتمادی اور انفرادیت سمجھتی ہو حقیقت میں یہ غرور و تکبر کا دوسرا نام ہے۔
ماریہ: میمونہ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟

میمونہ: بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ فیشن انسان میں غرور و تکبر پیدا کرتا ہے۔
ماریہ: لیکن فیشن سے انسان خوب صورت اور جدید دکھائی دیتا ہے۔
میمونہ: ایسی بات نہیں ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

اچھی صورت کو سنورنے کی ضرورت کیا ہے سادگی میں بھی قیامت کی ادا ہوتی ہے

ماریہ: یہ بات تو واقعی مسلمہ حقیقت ہے۔
میمونہ: اچھا بھئی دیکھوں تو سہی بیوٹی پارلر سے کیا چیز بن کر آئی ہو؟
ماریہ: (اپنے بڑھے ہوئے ناخن دکھاتے ہوئے) یہ دیکھو ناخن پیارے لگ رہے ہیں نا؟
میمونہ: یہ بڑھے ہوئے ناخن پیارے نہیں بلکہ مردہ اور مکروہ ہیں۔ کوئی مردہ کے ساتھ بھی کھانا پسند کرتا ہے؟ بڑھے ہوئے ناخن مردہ ہو جاتے ہیں اسی لیے انھیں کاٹتے ہوئے تکلیف نہیں ہوتی۔
ماریہ: میمونہ! تم بھی عجیب باتیں کر رہی ہو تعلیم یافتہ لڑکی ہو کر بھی ایسی باتیں کرتی ہو۔ ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں۔
میمونہ: یہ عجیب باتیں نہیں ہیں بلکہ حقیقت ہیں۔ عجیب تو تم خود لگ رہی ہو۔ تم نے اتنا چست اور تنگ لباس پہنا ہوا ہے۔ قمیص بھی تنگ اور شلوار بھی تنگ پاجامہ نما۔
ماریہ: اس میں کیا حرج ہے۔ یہ تو آج کا ہر دل عزیز فیشن ہے۔
میمونہ: یہ کیا فیشن ہے جو صریحاً ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ ایسا فیشن جو ہمارے مذہب سے متصادم ہو، غلط ہے۔ اسلام ایسے لباس سے منع کرتا ہے جس کو پہن کر جسم کے اعضا نمایاں ہوں۔ لباس جسم کو چھپانے کے لیے پہنا جاتا ہے نہ کہ مزید نمایاں کرنے کے لیے۔
ماریہ: تمھاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ آج فیشن کا زمانہ ہے اور ہر لڑکی فیشن کرتی ہے۔ میں اسے اپنا حق سمجھتی ہوں۔
میمونہ: ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے لیے آج کی دین سے ناواقف خواتین نہیں بلکہ ازواجِ مطہراتؓ اور صحابیاتؓ نمونہ ہیں۔
ماریہ: اچھا مان لیا، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ میک اپ تو کیا جا سکتا ہے؟
میمونہ: میک اپ اور زیب و زینت کی اجازت شادی شدہ عورت کے لیے ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے کر سکتی ہے۔
حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
"جو عورت عطر لگائے اور لوگوں پر سے گزرے کہ لوگ اُس کی خوش بو کو پائیں تو وہ زانیہ ہے۔ اور ہر آنکھ زنا کار ہوگی"
(مشکوٰۃ المصابیح، ابوداؤد)
چناں چہ اسلام ہر اُس فیشن اور لباس سے منع فرماتا ہے جس سے غیر محرم مائل ہو۔
ماریہ: (ماریہ افسردگی کے انداز میں) اُفوہ! خدایا
میمونہ: اور تم نے بھنویں جو بنوا رکھی ہیں اس کی ممانعت ہے۔ اس کے طبی لحاظ سے بھی کئی نقصانات ہیں اس سے بینائی کمزور ہوتی ہے اور چہرے کے اضافی بال نکلوانے سے یہ بال آہستہ آہستہ سخت ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ چہرے کی رعنائی تازگی اور فطری شگفتگی غائب ہو جاتی ہے اور چند ہی دنوں میں چہرہ ایسے لگ رہا ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی تازہ شیو بنوایا ہے۔
ماریہ: میمونہ! تمھاری خلوص و محبت سے معمور باتیں میرے دل کو لگی ہیں۔
میمونہ: مزید برآں اگر فیشن پرستی پر آنے والی کثیر لاگت ملک کی فلاح و بہبود اور غربا و مساکین کو دی جائے تو ایک طرف تو ملک کو بیش بہا فائدہ ہوگا اور دوسری طرف فیشن جیسی سماجی برائی کا خاتمہ ممکن ہوگا۔
ماریہ: واقعی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اللہ کرے پاکستان کی ہر عورت کی سوچ تمھاری جیسی ہو۔
میمونہ: ہاں! مجھے خوشی ہے کہ اب تم میری بات سمجھ چکی ہو، دراصل سادہ کپڑوں میں انسان سادہ مگر پُر وقار بھی نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اسراف سے بچنا چاہیے کیوں کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔
ماریہ: ان شاء اللہ میں آئندہ تمھاری نصیحت پر عمل کروں گی اور میں تمھاری شکر گزار ہوں کہ تم نے میری گمراہ سوچ کو درست کیا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کا علم اور عمل تقویت پائے۔

میمونہ: اللہ تعالیٰ آپ کو دین کی سمجھ عطا کرے۔
ماریہ: آمین
(دونوں ہم جماعت الوداعی تقریب کی جانب متوجہ ہو جاتی ہیں جہاں تلاوتِ کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہو رہا ہے۔)

29 ڈاکٹر اور مریض کے درمیان مکالمہ

(لاہور 2009ء)
(ڈاکٹر اپنے کلینک میں بیٹھا ہے۔ ایک شخص کلینک میں داخل ہوتا ہے، خالی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہوتا ہے۔)
مریض: السلام علیکم! ڈاکٹر صاحب
ڈاکٹر: وعلیکم السلام!
ڈاکٹر: کہیے کیسے آنا ہوا؟
مریض: آپ کے پاس آتا وہی ہے جو آفات و حادثات میں گرفتار ہو۔
(مریض کراہنا شروع کر دیتا ہے، درد اور تکلیف کے آثار اُس کے چہرے سے عیاں ہیں۔)
ڈاکٹر: کیا مرض لاحق ہوا ہے آپ کو؟
مریض: ڈاکٹر صاحب! مرض کی تشخیص کے لیے تو میں جناب کے پاس آیا ہوں۔ میرے سینے میں وقفے وقفے سے درد ہوتا ہے
ڈاکٹر: (سٹیتھو سکوپ اٹھا کر مریض کے سینے سے لگاتا ہے۔) ذرا کھانسیے۔
(مریض چند لمحے بمشکل کھانستا ہے۔ ڈاکٹر بڑے انہماک سے اس کی تشخیص میں مگن ہے۔)
کھانسی بھی نہیں ہے اور آپ کی چھاتی بھی بالکل ٹھیک ہے۔
مریض: ڈاکٹر صاحب تو پھر کیا مسئلہ ہے؟
ڈاکٹر: (ڈاکٹر دراز سے سفیگمو مانو میٹر نکال کر مریض کے بازو پر باندھتا ہے اور بلڈ پریشر چیک کرتا ہے اور سفیگمو مانو میٹر اتار کر کہتا ہے۔) آپ کا بلڈ پریشر 150-90 ہے۔
مریض: ڈاکٹر صاحب یہ 150-90 کا کیا مطلب ہے؟
ڈاکٹر: (حیرت سے مریض کو گھورتے ہوئے) ارے بھئی! اس کا مطلب ہے کہ آپ کی رگوں میں خون کی گردش بہت تیز ہو چکی ہے۔
مریض: اس میں کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟
ڈاکٹر: سراسر پریشانی ہے۔ اس سے ہارٹ وین ڈسٹرکشن یعنی دل کی نالی پھٹ سکتی ہے، جس سے ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے اور برین وین ڈسٹرکشن بھی ہو سکتا ہے۔ جو موت کا سبب بن سکتا ہے۔
مریض: (یہ سن کر مریض بوکھلا جاتا ہے) ڈاکٹر صاحب! مہربانی فرما کر اس کے سدِ باب کے لیے کوئی دوا تجویز کر دیجیے۔
ڈاکٹر: (دوا تجویز کرتے ہوئے) نسخہ تو میں لکھ دیتا ہوں لیکن اس سلسلے میں آپ کو چند احتیاطیں کرنا ہوں گی، ورنہ دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔
مریض: کیا احتیاطیں ڈاکٹر صاحب!
ڈاکٹر: سب سے بڑی احتیاط یہ کہ کوئی ٹینشن ہرگز نہ لی جائے۔ صبح سویرے سیر کیجیے۔ چکنائی یعنی گھی کا کم استعمال کیجیے۔ سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں۔
مریض: (ایک سرد آہ بھرتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب ٹینشن سے نجات تو بہت مشکل ہے۔ یہ تو ناممکن بات ہے کہ ایک مزدور ٹینشن سے بری ہو۔
ڈاکٹر: اس سلسلے میں آپ کو اپنا مکان کسی صاف ستھرے علاقے میں لینا ہوگا۔ کیوں کہ جراثیم مثلاً بیکٹیریا وائرسز، پروٹوزوا اور دیگر گندے علاقہ جات میں دس گنا جلدی پلتے ہیں۔
مریض: ڈاکٹر صاحب ہمارے مکان کے سامنے گندے پانی کا کھال بہتا ہے جو تمام جراثیموں کی افزائش کا مرکز ہے اور میرے حالات بھی مجھے گھر تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ڈاکٹر: اچھا کم از کم اپنا کمرا صاف ستھرا رکھا کریں۔
(چند لمحے سکوت طاری رہتا ہے)
مزید برآں الیکٹرو گرام ٹیسٹ بھی کروا لیجیے تاکہ سینے میں تکلیف کہیں دل کی خرابی کا نتیجہ نہ ہو اور یہ ٹیسٹ مجھے ضرور دکھائیے گا۔
مریض: اچھا ڈاکٹر صاحب یہ نسخہ دے دیجیے۔
(ڈاکٹر پیڈ پر سے صفحہ پھاڑ کر مریض کو تھما دیتا ہے۔ تین چار دواؤں کے نام دیکھ کر مریض کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی ہے)
یہ دوائیاں کچھ زیادہ نہیں لکھ دیں!
ڈاکٹر: نہیں ایک نسخے کے سائیڈ ایفیکٹ سے بچنے کے لیے دوسرا نسخہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ تین دن بعد تشریف لائیے گا۔
مریض: اگر ڈاکٹر صاحب جیب اجازت دے گی تو آ جاؤں گا۔ فی الحال تو دوائیاں لینا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔
(ڈاکٹر صاحب سے اجازت لینے کے بعد مریض دوائیں لینے کے لیے میڈیکل سٹور پر چلا جاتا ہے)

30 مالک مکان اور کرایہ دار کے درمیان مکالمہ

(سرگودھا یونیورسٹی 2007-09)
(کرایہ دار اپنے گھر سے باہر نکل کر سائیکل پر سوار ہو رہا ہوتا ہے کہ یکا یک اُسے مالک مکان دکھائی دیتا ہے۔ اُن میں سلسلۂ گفتگو یوں آغاز پاتا ہے۔)
مالک مکان: (ہاتھ ملاتے ہوئے) السلام علیکم!
کرایہ دار: وعلیکم السلام! کیا حال ہے جناب خیریت تو ہے؟
مالک مکان: جی ہاں خیریت ہے۔
کرایہ دار: (سائیکل سے اترتے ہوئے) تشریف لائیں جناب! باہر کیوں رک گئے ہیں؟
(کرایہ دار اندر جا کر بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہے اور مالک مکان کو اندر بٹھاتا ہے) فرمائیے کیسے آنا ہوا؟
مالک مکان: بس ذرا میں چاہتا تھا کہ آپ چند دنوں میں مکان خالی کر دیں۔
کرایہ دار: (استعجابیہ انداز میں) چند دنوں میں! صاحب آپ ہوش میں تو ہیں؟
مالک مکان: جی میرے حواس بالکل درست ہیں اور میں آپ کو یہی اطلاع دینے کے لیے آیا ہوں کہ آپ جتنی جلدی ہو سکے متبادل رہائش کا بندوبست کر لیں۔
کرایہ دار: مگر آپ کیا کریں گے مکان خالی کرا کے؟
مالک مکان: بس جناب یہ مت پوچھیے۔
کرایہ دار: کیا آپ کا خود اس مکان میں رہنے کا ارادہ ہے؟
مالک مکان: نہیں! بالکل نہیں۔
کرایہ دار: پھر آپ کا کیا مقصد ہے۔ آخر کوئی وجہ تو ہوگی۔ ورنہ مکان کون خالی رہنے دیتا ہے؟
مالک مکان: بس جی۔ آپ اس موضوع کو مت چھیڑیے۔
کرایہ دار: نہیں جناب! آپ کو بہر حال اس کی وجہ تو بتانا ہوگی کہ ہمارے پاس مکان محفوظ نہیں یا ہم کرایہ کی ادائیگی میں دیر کرتے ہیں؟
مالک مکان: نہیں ایسی کوئی بات نہیں (چند لمحے سوچتا ہے پھر ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کرتا ہے) دراصل ۔۔۔۔ وہ بات یہ ہے ۔۔۔۔۔ کہ جو کرایہ آپ دیتے ہیں مجھے اُس سے زیادہ مل رہا ہے۔
کرایہ دار: اچھا تو کتنا زیادہ کرایہ مل رہا ہے آپ کو؟
مالک مکان: مجھے سات ہزار روپے مل رہے ہیں جب کہ آپ پانچ ہزار روپے دیتے ہیں۔
کرایہ دار: دیکھیے، صاحب آپ کرایہ بڑھانے کے لیے غلط طریقہ استعمال کر رہے ہیں۔
مالک مکان: میں نے تو آپ کو کرایہ بڑھانے کے لیے نہیں کہا۔
کرایہ دار: مجھے معلوم نہ تھا کہ پانچ سال سے بٹھائے ہوئے معتبر کرایہ دار کو ایک دن یوں دھوکا دیں گے۔

مالک مکان: چلیں، میں آپ کے تعلقات کو مدِنظر رکھ کر آپ کو دو ماہ کا وقت دے دیتا ہوں۔
کرایہ دار: دیکھیے صاحب! یہ آپ کی صریح زیادتی ہے۔ اب ہم کہاں خوار ہوتے پھریں گے۔ کچھ مہربانی کیجیے۔
مالک مکان: بس آپ کو دو ماہ کا وقت دے رہا ہوں۔
کرایہ دار: اچھا محترم لیجیے! اگلے ماہ سے آپ چھ ہزار روپے ماہانہ وصول کیجیے گا۔ مبارک ہو کہ آپ کا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔
مالک مکان: (حیرت سے) دیکھیے میں نے کرایہ بڑھانے کو نہیں کہا۔
کرایہ دار: آپ نے تو نہیں کہا لیکن آپ کرایہ بڑھانے کی خاطر کسی دوسرے کو مکان دے رہے ہیں۔
مالک مکان: لیکن مجھے تو وہاں سے سات ہزار روپے مل رہے ہیں۔
کرایہ دار: حضرت! دیکھیے کچھ تعلقات کا ہی لحاظ کیجیے۔ (جذباتی ہو کر) مہنگائی گلا گھونٹ رہی ہے۔
مالک مکان: واقعی مہنگائی نے تو ہر شخص کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔
کرایہ دار: آپ تو کاروباری شخص ہیں لیکن ہم مزدور ہیں آپ سے کہیں زیادہ اثر ہم پر ہوتا ہے۔ دیکھیے صاحب بس اگلے ماہ سے چھ ہزار رُوپے لیجیے گا۔ (چند لمحے سکوت طاری رہتا ہے)
مالک مکان: چلیں میں آپ کی خاطر ہزار رُوپے کا خسارہ برداشت کر لیتا ہوں۔
کرایہ دار: شکریہ جناب۔
مالک مکان: اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں، اگلے ماہ دوبارہ ملیں گے۔
کرایہ دار: ان شاء اللہ! ضرور ملاقات ہوگی۔
(مالک مکان اجازت لے کر چلا جاتا ہے اور کرایہ دار سائیکل پر سوار ہو کر کام کے لیے چلا جاتا ہے۔)

31 پھل فروش اور گاہک کے درمیان مکالمہ

(لاہور 2009 ملتان 2009,10)

(سخت لو چل رہی ہے۔ ایک چھپر تلے خستہ حال پھل فروش بیٹھا ہے۔ اتنے میں ایک گاہک نمودار ہوتا ہے اور پھل فروش کو مخاطب کرتا ہے۔)
گاہک: السلام علیکم!
(پھل فروش نیم خوابیدہ ہے۔ سلام کا جواب نہ ملنے پر گاہک اُسے دوبارہ اونچی آواز میں سلام کرتا ہے۔)
السلام علیکم جناب!
پھل فروش: (یکا یک بیدار ہوتے ہوئے) وعلیکم السلام!
گاہک: کچھ پھل خریدنا تھے بھائی۔ لیکن ادھر آ کر عجب منظر دیکھنا پڑ رہا ہے۔
پھل فروش: بس بھائی رات گیارہ بجے گھر جاتا ہوں اور صبح پانچ بجے سبزی منڈی جانا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے یہ کیفیت ہو جاتی ہے، اچھا کیا پسند فرمائیں گے آپ؟
گاہک: اچھے سے آم دکھایئے ذرا۔
پھل فروش: آم کیسا چاہیے۔ دسہری، چونسہ، لنگڑا، انور رٹول یا ثمر، فرمایئے کون سا دوں؟
گاہک: لنگڑا ہی دکھا دیجیے بھائی! چونسہ خریدنے کی جیب متحمل نہیں ہے ابھی۔
پھل فروش: (دو آم اُٹھا کر صاف کر کے گاہک کو دکھاتے ہوئے) یہ دیکھیے جناب۔
گاہک: ایک کلو کی کیا قیمت ہے؟
پھل فروش: ستر روپے کلو۔
گاہک: (حیرت سے) ستر! کیا آج کا تمام منافع میری جیب سے نکالنے کا ارادہ ہے؟
پھل فروش: نہیں جناب میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں۔
گاہک: اچھا چھوڑو مجھے جلدی ہے۔ پینسٹھ روپے لگاؤ اور ڈیڑھ کلو تول دو۔

پھل فروش: (تولتے ہوئے) بس جناب! ہم تو آپ کا خیال کرتے ہیں۔
گاہک: تبھی تو آپ ہمیں خوب لوٹتے ہیں۔
پھل فروش: (تول کر رکھتے ہوئے) ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو آپ سے بالکل مناسب قیمت لیتا ہوں۔ اور کیا پسند فرمائیں گے؟
گاہک: بس یار، بچوں نے کئی فرمائشیں کی ہیں، دراصل چھوٹے بچے کی سالگرہ ہے، جس کی وجہ سے آپ کے ہاں آنا ہوا (چند لمحوں بعد) اچھا یہ آڑو کیا بھاؤ ہیں؟
پھل فروش: دیکھ لیجیے۔ زبردست خوش بودار آڑو ہیں۔
گاہک: (سوچتے ہوئے) اچھا کلو کی کیا قیمت ہے؟
پھل فروش: ایک سو بیس روپے کلو ہیں۔ کوئٹہ کے بہترین آڑو ہیں۔
گاہک: (قیمت سنتے ہی آڑو فوراً واپس رکھ دیتا ہے) نہیں بس رہنے دیجیے۔
پھل فروش: کیا ہوا آپ تو قیمت سن کر سہم گئے ہیں۔
گاہک: آپ نے قیمت ہی زیادہ بتائی ہے۔
پھل فروش: چلیے سو روپے لگا لوں گا۔
گاہک: اچھا چلیں ایک کلو دے دیجیے۔
پھل فروش: (پھل فروش آڑو تول کر رکھ دیتا ہے)
گاہک: اچھا یہ کھجور تو دکھایئے۔
پھل فروش: (کھجوروں کا چلو بھر کے گاہک کے ہاتھ پر انڈیلتے ہوئے) یہ جج عباسیاں کی میٹھی کھجور ہے۔
گاہک: ایک کلو کی کیا قیمت ہے؟
پھل فروش: پچاس روپے کلو
گاہک: اچھا ایک کلو دے دو۔
پھل فروش: یہ لیجیے جناب۔ ایک کلو کھجور
گاہک: کل کتنی رقم ہو گئی؟
پھل فروش: (تمام پھلوں کے چھوٹے شاپروں کو بڑے شاپر میں رکھتے ہوئے منہ ہی منہ میں حساب کرتے ہوئے تقریباً سرگوشی میں) ترپن اور سو اور پچاس۔ (اونچی آواز میں) دو سو تینتیس روپے ہو گئے جی۔
گاہک: (پھل اُٹھاتے ہوئے دو سو روپے تھما دیتا ہے) یہ لیجیے۔ ٹھیک ہے۔
پھل فروش: ٹھیک ہے، شکریہ جناب۔
(گاہک پھل اُٹھا کر چل دیتا ہے)

32 دو دوستوں کے درمیان کمپیوٹر/انٹرنیٹ کے نقصانات اور افادیت پر مکالمہ

(فیصل آباد 2005، گوجرانوالہ 2010، بہاول پور 2015،، راولپنڈی بورڈ 17، آزاد کشمیر بورڈ 18، لاہور، گوجرانوالہ، ملتان، سرگودھا 2019)

(عاطف اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر موسیقی سن رہا ہے۔ اتنے میں باہر دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ عاطف اُٹھ کر دروازہ کھولتا ہے تو اپنے ہم جماعت عمیر سے ملتا ہے۔ سلسلۂ کلام کا آغاز یوں ہوتا ہے)
عمیر: السلام علیکم!
عاطف: وعلیکم السلام!
عمیر: خیریت تو ہے پورے محلے کو سر پر اُٹھا رکھا ہے؟
عاطف: کیا ہوا؟ کیا مصیبت آن پڑی ہے؟
عمیر: یہ جو تم نے اتنی بلند آواز میں گانے چلائے ہوئے ہیں کہ پورا محلہ لرز رہا ہے۔
عاطف: اچھا اندر آ جاؤ۔

عمیر: چلو! میرا تو خیال تھا کہ آج شاید تمھارا بٹھانے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔

عاطف: نہیں بھئی ایسی بات نہیں۔

(دونوں دوست کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں)

عمیر: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کیسے کڑے ہاتھ ہیں کہ جو ان کی زد میں آ جائے نکل نہیں سکتا اور ان سحر انگیز آلات میں مقید شخص کسی بے بس ہاتھی کی طرح اِن کی دلدل میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔

عاطف: (ہنستے ہوئے) کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تفریحِ طبع کا ذریعہ ہیں۔

عمیر: وہ کیسے؟

عاطف: کمپیوٹر انسان کی تھکاوٹ دور کر سکتا ہے۔

عمیر: تھکاوٹ کا کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے کیا تعلق ہے؟

عاطف: تم بھی کیا بھولے ہو۔ انٹرنیٹ کی ویڈیوز اور آڈیو ویڈیو گانے وغیرہ۔ یہ سب تھکاوٹ کو پلک جھپکنے میں ختم کر دیتے ہیں۔

عمیر: (طنزاً) تم ان سے تھکاوٹ دور کرتے ہو؟

عاطف: میں تو زیادہ وقت کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی آغوش میں گزارتا ہوں۔

عمیر: اوہ خدارا! ان نیم عریاں نہیں بلکہ قطعی عریاں ویڈیوز نے اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا ہے۔

عاطف: یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟

عمیر: ہاں میں جانتا ہوں میری باتیں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے تمھاری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ گناہ کی یہ انتہا ہوتی ہے کہ انسان گناہ کو گناہ نہیں سمجھتا۔ بقول الطاف حسین حالی:

عجب نہیں، رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز — کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

عاطف: تم مجھ پر طنز کر رہے ہو؟

عمیر: نہیں صرف تم ہی نہیں، انٹرنیٹ نے تو سیکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ ہمارے لاکھوں نوجوانوں کو خوابِ غفلت کا شکار کر دیا ہے۔ یہ لوگ اس کے نقصانات سے ناواقف ہیں۔

عاطف: کیسے نقصانات؟

عمیر: اوّل تو یہ کہ اذہان خراب، دوم وقت کا ضیاع، سوم دولت کا ضیاع اور چہارم معاشرتی بے راہ روی اس کا نتیجہ ہے۔

عاطف: تمھارا کیا خیال ہے کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال نہ کیا جائے؟

عمیر: نہیں میں نے یہ کب کہا ہے؟

عاطف: تمھاری طنزیہ باتوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔

عمیر: ہرگز نہیں! میں نے صرف اس کے منفی پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے مثبت کی نہیں۔

عاطف: مثبت پہلو کون سے؟

عمیر: دیکھو بھئی! آج کے دور میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہماری اہم ضرورت ہیں۔ کمپیوٹر نے دنیا کو گلوبل ویلج میں تبدیل کر دیا ہے۔

عاطف: ہاں یہ تو ہے۔

عمیر: اس کے علاوہ انٹرنیٹ معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آپ کسی بھی موضوع پر دنیا کی کسی بھی یونی ورسٹی اور کالج کے سکالرز کے لیکچرز وصول کر سکتے ہیں۔ اس طرح تعلیمی میدان میں یہ مفید ذریعہ ہے۔ آج اس متنوع اور ہمہ گیر ایجاد نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔

عاطف: اس کے علاوہ اور کون کون سے شعبے ہیں؟

عمیر: بنکنگ کا شعبہ ہو یا ایجوکیشن کا میدان بلکہ اب تو مستقبل قریب میں انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کاروباری حیثیت اختیار کر رہا ہے اور خرید و فروخت کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے ہو جائے گی۔ اب بھی دنیا کے بعض ترقی یافتہ ممالک میں یہ طرزِ تجارت جاری ہے۔

عاطف: واقعی! میں اب تمھاری بات سمجھ رہا ہوں کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کتنی بڑی نعمت ہے۔ لیکن ہم نے اسے سب سے بڑی زحمت

بنا لیا ہے۔ آیندہ میں اس کا درست استعمال کرنے کی کوشش کروں گا اور تعلیم پر اپنا وقت صرف کروں گا۔

مجھے تم جیسے دوست پر فخر ہے۔

عمیر: مجھے نہایت خوشی ہے کہ تم نے میری بات سمجھ لی (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ!

عاطف: اللہ حافظ!

(عمیر مرکزی شاہراہ کے ہجوم میں غائب ہو جاتا ہے اور عاطف دروازے میں کھڑا اُسے دیکھ رہا ہے)

33 سبزی فروش اور گاہک کے درمیان مکالمہ

(ملتان 2009,10، بہاول پور 2011.12 فنی بورڈ 13، راولپنڈی بورڈ 17، ساہی وال بورڈ 18)

(ایک سبزی فروش نے ٹوکریوں میں سبزی سجا رکھی ہے اور ان کو تازہ رکھنے کے لیے ان پر پانی کا چھڑکاؤ بھی کر رہا ہے۔ اتنے میں ایک گاہک آتا ہے اور اس سے یوں ہم کلام ہوتا ہے)

گاہک: السلام علیکم!

سبزی فروش: وعلیکم السلام!

(گاہک چند لمحے سبزیوں کو تکتا رہتا ہے)

سبزی فروش: بتائیے جناب! کیا خدمت کروں؟

گاہک: سبزی خریدنی ہے۔

سبزی فروش: وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ سبزی خریدنی ہے لیکن کون سی سبزی؟ گوبھی، آلو، مٹر، پالک، میتھی، بینگن، اروی، کدو، نینڈے، بھنڈی، توری یا ساگ۔۔۔۔۔۔

گاہک: (ٹوکتے ہوئے) بس کیجیے جناب! آپ تو ایسے بتا رہے ہیں جیسے مجھے تمام دُکان خریدنی ہے۔ اچھا ذرا پالک۔۔۔۔ (چند لمحے رُک جاتا ہے)

سبزی فروش: جی جی کیا کہہ رہے تھے آپ؟ پالک۔۔۔۔۔۔!

گاہک: ہاں میں سوچ رہا ہوں کہ پالک ہی لے لوں۔

سبزی فروش: جلدی بتائیے میں تول دیتا ہوں۔

گاہک: اچھا یہ پالک کیا بھاؤ ہے؟

سبزی فروش: (پالک کا گچھا اُٹھاتے ہوئے) یہ دیکھیے پالک، بالکل تازہ اور سرسبز، سونگھیے ذرا، اس کی خوش بو آپ کے رگ و پے میں سرایت کر جائے گی۔

گاہک: پہلے آپ قیمت بتائیں؟

سبزی فروش: جناب! پالک بیس روپے کلو۔

گاہک: (ہکلاتے ہوئے) کیا کیا؟ بیس روپے؟؟؟ مقامی سبزی اور قیمت کا یہ حال؟

سبزی فروش: بس جناب مہنگائی کی شدت آپ کے سامنے ہے۔

گاہک: اچھا تنقید و تبصرہ کو چھوڑیے اور بتائیے کہ بارعایت کتنے روپے ہوں گے؟

سبزی فروش: رعایت کی گنجائش تو نہیں۔ چلو آپ کا لحاظ کرتے ہوئے اٹھارہ روپے ہو جائے گی۔

گاہک: اچھا بس بحث میں مت پڑو۔ پچاس روپے کی تین کلو دے دو۔

سبزی فروش: (تولتے ہوئے) بس جناب مناسب تو نہیں پھر بھی لے جائیے۔

(سبزی فروش تین کلو پالک تول کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔)

گاہک: اچھا اروی کیسے کلو ہے؟

سبزی فروش: ستر روپے کلو۔

گاہک: بس بس رہنے دیجیے۔ آلو ہی ٹھیک رہیں گے۔ میں نے سوچا تھا کہ پالک میں اروی ڈال لی جائے خستگی بڑھ جائے گی۔ لیکن جیب متحمل نہیں ہے۔ آلو کیا بھاؤ ہیں؟

سبزی فروش: لیکن آلو چالیس روپے اور سفید آلو تیس روپے کلو۔
گاہک: سفید آلوؤں کی قیمت کم کیجیے۔
سبزی فروش: نہیں نہیں جناب! اس سے ایک روپیہ بھی کم نہیں ہو گا۔
گاہک: اچھا چلو اٹھائیس روپے کے دو کلو دے دو۔
(سبزی فروش پہلے نہیں مانتا لیکن مسلسل اصرار کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔)
سبزی فروش: (تولتے ہوئے) لیجیے جناب اور حکم کیجیے۔
گاہک: بھنڈی کی کیا قیمت ہے؟
سبزی فروش: بھنڈی پچاس روپے کلو ہے۔
گاہک: کوئی رعایت، کوئی گنجائش؟
سبزی فروش: بس پینتالیس روپے ہو جائے گی۔
گاہک: چلو تول دو۔ اب کیا بحث کی جائے؟
سبزی فروش: کتنی؟
گاہک: ایک کلو۔
سبزی فروش: لیجیے جناب۔ مزید فرمایئے۔
گاہک: کتنے پیسے ہو گئے؟
(سبزی فروش حساب شروع کر دیتا ہے لیکن اسی اثنا میں گاہک اُسے ٹوک دیتا ہے۔)
گاہک: اوہو! یاد آیا پیاز بھی لینے تھے۔
سبزی فروش: پیاز کتنے ہوں؟
گاہک: قیمت کیا ہے؟
سبزی فروش: بیس روپے کلو۔
گاہک: چلو پانچ کلو نوے روپے کے لگاؤ۔
(سبزی فروش چپ چاپ تولنا شروع کر دیتا ہے۔)
سبزی فروش: لیجیے جناب۔
گاہک: کتنے پیسے ہو گئے؟
سبزی فروش (کیلکولیٹر تھام کر حساب کرتا ہے، پچاس، پینتیس، پینتالیس اور نوے) دو سو بیس روپے
(سبزی فروش چاروں تھیلوں کو ایک بڑے تھیلے میں ڈال دیتا ہے)
گاہک: (پیسے دیتے ہوئے) یہ لیجیے دو سو بیس روپے۔
سبزی فروش: (گن کر) ٹھیک ہیں۔
گاہک: اچھا بھئی! اللہ حافظ
سبزی فروش: اللہ حافظ
(گاہک سبزی کا تھیلا اُٹھا کر گھر کی جانب چل دیتا ہے۔)

34 دو دوستوں کے درمیان ڈینگی ایک وبا کے عنوان پر مکالمہ

(عاطف اور ثاقب دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔ عاطف وقفہ کے دوران میں کالج کے صحن میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ ثاقب اس کے پاس آتا ہے اور دونوں میں گفتگو کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے۔)
ثاقب: السلام علیکم!
عاطف: وعلیکم السلام!

ثاقب: آج آپ کا ہم جماعت زوہیب دکھائی نہیں دے رہا۔ کیا وہ چھٹی پر ہے؟
عاطف: جی ہاں! اسے ڈینگی بخار ہو گیا ہے، اس لیے وہ آج غیر حاضر ہے۔
ثاقب: یہ تو بڑی افسوس ناک خبر ہے۔
عاطف: جی ہاں! آج ہمارے ملک خصوصاً پنجاب میں ڈینگی بخار بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے کتنے ہی لوگ زندگی کی بازی ہار چکے ہیں۔
ثاقب: سنا ہے کہ اس بیماری کے علاج کے لیے کوئی ویکسین بھی دریافت نہیں ہوئی۔
عاطف: جی ہاں! یہ حقیقت ہے لیکن بیماری جو بھی ہو اس سے بچاؤ کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ ڈینگی بخار سے بچاؤ کے لیے اگر احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں تو اس سے بچاؤ ممکن ہے۔
ثاقب: اس سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر کیا ہیں؟
عاطف: اس سے بچاؤ کی تدابیر آسان ہیں۔ چوں کہ اس بیماری کا سبب بننے والے مچھر پانی پر پرورش پاتے ہیں اس لیے گھر میں اور گھر سے باہر پانی جمع نہیں ہونا چاہیے۔ صفائی کا خیال رکھنا چاہیے اور کھانے پینے کی اشیا کو ڈھانپ کر رکھا جائے۔
ثاقب: اس سے بچاؤ کے لیے مزید کن احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنا چاہیے؟
عاطف: مچھر مار اسپرے کیا جائے، جسے ڈینگی بخار ہو اسے مچھروں سے بچانے کے لیے رات کو سوتے وقت مچھر دانی کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ مچھر بیماری کے جراثیم دوسرے افراد میں منتقل نہ کر سکے۔
ثاقب: ڈینگی کے مریض کو دوائیں کون سی دی جاتی ہیں؟
عاطف: اس بیماری کا کوئی خاص علاج نہیں، آرام کرنے اور پیراسیٹامول کے استعمال سے ہی مریض ایک ہفتے میں صحت یاب ہو جاتا ہے۔
ثاقب: حکومت بھی اس بیماری کی روک تھام کے لیے اقدامات کر رہی ہے اور عوام کو بھی چاہیے کہ بیماری سے بچاؤ کے لیے حفاظتی اقدامات کرے تاکہ لوگ محفوظ رہ سکیں۔
عاطف: ہسپتالوں میں بھی صفائی کا خاص انتظام ہونا چاہیے، کیوں کہ وہاں سے بھی اس کے پھیلنے کا خطرہ ہے۔
ثاقب: یہ مرض سب سے پہلے کہاں سے پھیلا اور اس کے پھیلاؤ کا سبب کون سا مچھر ہے؟
عاطف: یہ مرض سب سے پہلے افریقہ میں پایا گیا اور پھر پورے ایشیا میں پھیلا۔ ایڈیز مچھر اس بیماری کے پھیلاؤ کا ذریعہ ہے۔
ثاقب: سنا ہے کہ یہ مچھر سری لنکا سے درآمد کیے جانے والے ٹائروں کے ذریعے پاکستان میں آئے۔ لیکن ٹائروں میں مچھر کیسے آ سکتے ہیں؟
عاطف: ان ٹائروں میں صاف پانی موجود تھا جن میں ان کی پرورش ہوئی۔
ثاقب: کیا آپ کو اس بیماری کی علامات کا پتا ہے کہ جن کے ذریعے اس کی نشان دہی ہوتی ہے؟
عاطف: جی ہاں! اس بیماری میں جسم پر سرخ دھبے نمایاں ہوتے ہیں، سر میں درد، آنکھوں میں درد، ریڑھ کی ہڈی میں بھی درد ہوتا ہے۔ دراصل ڈینگی وائرس ہمارے خون کے سفید خلیوں کی تعداد کو خطرناک حد تک کم کر دیتا ہے۔
ثاقب: پھر تو جب کسی میں یہ علامتیں ظاہر ہوں، فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے اور علاج میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔
عاطف: جی ہاں بالکل! مریض کو دوسرے لوگوں سے الگ رکھنا چاہیے اور اسے نرم غذا دینی چاہیے۔
ثاقب: عاطف بھائی! آپ کو یہ معلومات کہاں سے ملیں؟
عاطف: انٹرنیٹ اور مختلف اخبارات سے ڈینگی کے بارے میں معلومات ملی ہیں۔
ثاقب: اس سے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہ بیماری اتنی خطرناک نہیں ہے بلکہ اس بیماری کے متعلق کم آگاہی خطرناک ہے۔ اگر لوگوں کو اس بیماری کے بارے میں آگاہی اور شعور ہو تو وہ اس سے بچ سکتے ہیں۔
عاطف: حکومت بھی اس بیماری سے بچاؤ کے لیے خاطر خواہ کردار ادا کر رہی ہے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے بھی عوام میں شعور اور واقفیت بڑھ رہی ہے۔

ثاقب: درحقیقت یہ بیماری ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس

ترجمہ: زمین پر جو فسادات نمودار ہوتے ہیں وہ انسانوں کے اپنے ہاتھوں کے کرتوت ہیں۔ ایک شاعر کے بقول:

؎ جاری ہے ازل سے یہی قانونِ الٰہی
اعمال بگڑتے ہیں تو آتی ہے تباہی

عاطف: جی ہاں! نہ صرف یہ بیماری بلکہ آج کل تو نت نئی بیماریاں پھیل رہی ہیں، جن کا پہلے نام ونشان بھی نہ تھا۔ ہمیں اپنے اعمال درست کرنے چاہییں اور اللہ سے رجوع کرنا چاہیے۔

ثاقب: آپ نے بالکل بجا فرمایا۔

عاطف: اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی حفظ وامان میں رکھے اور اس جیسی تمام موذی بیماریوں سے بچائے۔

ثاقب: آمین: آپ کا بہت شکریہ بھائی عاطف! آپ نے مجھے مفید معلومات سے آگاہ کیا۔ میں آج ہی اپنے گھر والوں اور دوستوں کو معلومات فراہم کروں گا۔ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ زوہیب کو اس مرض سے نجات عطا فرمائے۔

عاطف: آمین۔

(وقفہ کے اختتام کی گھنٹی بجتی ہے تو دونوں دوست اپنی جماعت کے کمرے کی طرف چل پڑتے ہیں۔)

35 دو دوستوں کے درمیان توانائی کا بحران کے عنوان پر مکالمہ

(سرگودھا بورڈ 2018، بہاول پور 2016، لاہور 2018)

(ثاقب اور شعیب ایک ہی محلہ میں رہتے ہیں۔ شعیب، ثاقب سے ملنے کے لیے اس کے گھر جاتا ہے اور دونوں میں سلسلۂ کلام کا آغاز ہوتا ہے۔)

شعیب: السلام علیکم!

ثاقب: وعلیکم السلام!

شعیب: خیریت تو ہے ثاقب: کیوں پریشان بیٹھے ہو؟

ثاقب: نہ گیس ہے اور نہ ہی بجلی، یہ بھی کوئی زندگی ہے بھلا۔

شعیب: حالات سے اس قدر شکوہ کیوں! صبر سے کام لو۔ اگر آج ہمارے ہاں توانائی کا بحران ہے تو ان شاء اللہ آنے والے وقتوں میں

ثاقب: کب ہوں گے حالات تبدیل! پچھلے کئی سالوں سے پاکستان کے عوام گیس اور بجلی کی کمی کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن کسی بھی حکومت نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔

شعیب: یہ تو ہے۔ آج عوام کو نہ صرف بجلی اور گیس بلکہ پٹرول اور سی۔ این۔ جی کی قلت کا بھی سامنا ہے۔

ثاقب: آخر کوئی تو وجہ ہوگی اس بحران کی؟

شعیب: بجلی کی کمی کی اولین وجہ ڈیموں اور پانی کی کمی ہے۔ ہماری ہر حکومت نے اس معاملے میں لاپروائی کا مظاہرہ کیا ہے جب کہ ہمسایہ ملک بھارت نے پچھلے چند سالوں میں ایک سو نئیں ڈیم بنا لیے ہیں۔ لیکن ہم نے صرف تین ڈیم بنائے ہیں۔ جن میں سے گالا باغ ڈیم اب بھی سیاسی اختلافات کی نذر ہے۔

ثاقب: بجلی اور گیس کی کمی سے نہ صرف کارخانوں اور فیکٹریوں بلکہ گھریلو صارفین کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

شعیب: اس سے قبل جب بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہوتی تھی تو اس قدر پریشانی نہیں ہوتی تھی کیوں کہ گیس کی مدد سے کافی کام ہو جاتے تھے، لیکن اب گیس بھی ناپید ہے اور گھریلو صارفین سلنڈر اور لکڑیاں استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

ثاقب: بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ سے طلبہ کا مستقبل بھی داؤ پر لگ رہا ہے۔ سارا دن سکول وکالج میں رہنے کے بعد رات کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ جب پڑھائی توجہ سے کر سکتے ہیں لیکن یہ قیمتی وقت بھی بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ کی نذر ہو جاتا ہے۔

شعیب: گیس، تیل اور سی این جی کی قلت سے عوام کو بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پٹرول پمپ اور سی این جی سٹیشنز پر گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔

ثاقب: اس بحران نے نہ صرف ہمارے ملک بلکہ دنیا کے کئی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ہر ملک گیس اور تیل کے نئے ذخائر کی تلاش میں ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔

شعیب: سارا دن بجلی اور گیس نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ لیکن ان کا بل آتا ہے تو ہوش اڑ جاتے ہیں۔

ثاقب: اسی لیے تو انور مسعود نے کہا تھا:

جو چوٹ بھی لگی ہے وہ پہلی سے بڑھ کے تھی
ہر ضرب کرب ناک پہ میں تلملا اٹھا
پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا
بل اتنے مل گئے ہیں کہ میں بلبلا اٹھا

شعیب: واہ! واہ! سخن شناس ہو گئے ہو۔

ثاقب: ایسے کٹھن حالات ہی تو انسان کو زبان دے دیتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ملک توانائی کے بحران کے بھنور میں اس قدر پھنس چکا ہو اس کا مستقبل کیا ہوگا؟

شعیب: مستقبل تو صرف اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جب تک عوام اپنے حالات بدلنا نہ چاہیں گے تو اللہ بھی اس قوم کی حالت نہیں بدلے گا۔

ثاقب: اس لیے بحران پر قابو پانے کے لیے ہمیں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

شعیب: ہمیں چاہیے کہ ذاتی گاڑیوں کی بجائے پبلک ٹرانسپورٹ کو ترجیح دیں۔ بلب کی بجائے انرجی سیور استعمال کریں۔ گیس کا چولھا صرف ضرورت کے وقت ہی استعمال کریں۔

ثاقب: حکومت کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

شعیب: اگر حکمران چاہیں تو بحران کا حل بخوبی نکالا جا سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے پاکستان کو ایسے حکمران ہی میسر نہیں ہیں کہ جنھیں عوام کے دکھوں کا ذرا بھی احساس ہو۔

ثاقب: یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں گیس اور بجلی کی شدید قلت کا سامنا ہے۔ عوام ذہنی پریشانی میں مبتلا ہے۔

شعیب: گیس کے بحران کو ختم کرنے کے لیے ایران گیس پائپ لائن بچھانے کے لیے تیار ہے لیکن ہمارے حکمرانوں نے اس منصوبے کو بھی التوا میں ڈالا ہوا ہے۔

ثاقب: میرے خیال میں تو حکومت کو چاہیے کہ وہ تیل اور گیس کے نئے ذخائر کی تلاش کی طرف توجہ دے اور اس مقصد کے لیے کثیر رقم مختص کرے۔

شعیب: دراصل حکومت اور عوام کی مشترکہ کوششوں سے اس بحران پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ثاقب: جی ہاں! بالکل آپ نے بجا فرمایا:

شعیب: اچھا بھائی ثاقب! اب مجھے اجازت دیں۔ اللہ حافظ

ثاقب: اللہ حافظ

(شعیب اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

36 باقاعدہ کلاس لینے کے فوائد پر دو طالب علموں کے درمیان مکالمہ

(لاہور بورڈ 10-2005ء)

(اویس سڑک کے کنارے جا رہا ہے کہ اچانک اس کی ملاقات اس کے دوست علی سے ہوتی ہے اور ان کے درمیان سلسلۂ گفتگو یوں شروع ہوتا ہے۔)

اویس: السلام علیکم!

علی: وعلیکم السلام!

اویس: جناب خیر تو ہے کہاں رہے اتنے دن، پچھلے چھے دنوں سے کالج ہی نہیں آ رہے، کوئی مسئلہ ہے کیا؟

علی: نہیں! مسئلہ تو کوئی نہیں۔

اویس: پھر کالج سے اتنے دن غیر حاضری کی کیا وجہ؟

علی: بس ویسے ہی نہیں آیا، دل نہیں کر رہا تھا پڑھنے کو۔

اویس: مگر یار مجھے دن! اتنے دن تم نے ضائع کر دیے؟

علی: نہیں ضائع نہیں کیے، تھوڑا بہت پڑھا بھی ہے۔

اویس: ابھی تو ہمارا نصاب شروع ہی ہوا ہے اور تم نے ابھی سے اتنی چھٹیاں کرنا شروع کر دیں۔ یہ تو تم نے اپنا بڑا نقصان کیا ہے۔

علی: کیسا نقصان؟ یار! ابھی پورا سال باقی ہے۔ پڑھ لیں گے اور پاس بھی ہو جائیں گے۔

اویس: مگر تم نے جو کلاسیں چھوڑ دی ہیں اب دوبارہ تمھیں یہ موقع نہیں ملے گا۔ کیا تم جانتے نہیں:

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں (میر حسن)

علی: یار تم بہت عجیب باتیں کر رہے ہو، مجھے تمھاری باتیں سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ آخر چند دن کلاس نہ لینے سے کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔

اویس: دیکھو یار باقاعدہ کلاس لینے کے بہت سے فائدے ہوتے ہیں۔ اگر آپ روز کا کام روز نہیں کرتے اور اپنا سبق کسی وجہ سے یاد نہیں کر پاتے، تو پھر بھی فارغ وقت میں اسے یاد کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ ہمیں اس کے بارے میں سمجھ بوجھ تو ہوتی ہے۔

علی: ہاں یہ تو ہے مگر ایک طالب علم کے لیے آرام بھی تو ضروری ہوتا ہے۔

اویس: آرام کے لیے ہفتے میں ایک چھٹی کافی ہے اور ہمیں محنت کی عادت ڈالنی چاہیے کیوں کہ

"مسلسل محنت کامیابی کا راز ہے"

علی: تمھاری بات بالکل ٹھیک ہے۔

اویس: اگر اس دنیا میں کوئی نام پیدا کرنا ہے تو ہمیں سخت محنت کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ مشہور ہے کہ:

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

علی: ہاں یار! یہ بات تو ہے، اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔

اویس: اگر ہم باقاعدہ کلاس لیں گے تو اساتذہ کرام کی نظر میں بھی اچھے طالب علم تصور ہوں گے اور ہماری باقاعدگی اساتذہ کرام کے ساتھ اچھے تعلقات کی استواری میں معاون ثابت ہوگی۔

علی: اب میں بھی باقاعدہ کلاس لوں گا۔

اویس: کیا میں یہ امید رکھوں کہ تم کل کالج ملو گے۔

علی: جی ہاں بالکل! کیوں نہیں۔

اویس: اب میں چلتا ہوں۔ اچھا اللہ حافظ!

علی: اللہ حافظ!

(دونوں دوست مخالف سمت میں چل پڑتے ہیں۔)

37 کیبل کے فوائد اور نقصانات کے عنوان پر دو دوستوں کے درمیان مکالمہ

(فنی بورڈ 17)

(جمشید سٹی پارک میں بنچ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا دوست ہارون آتا ہے اور یوں ہم کلام ہوتا ہے۔)

ہارون: السلام علیکم!

جمشید: وعلیکم اسلام!

ہارون: جمشید کیسے ہو؟

جمشید: میں ٹھیک ہوں۔

ہارون: نہیں بھئی، تمھارے چہرے سے پریشانی اور اداسی عیاں ہو رہی ہے۔

جمشید: بس یار کیا بتاؤں، چھوٹا بھائی میٹرک میں فیل ہو گیا ہے۔

ہارون: تمھارا مطلب ہے کہ علی فیل ہو گیا ہے۔

جمشید: کل اس کا نتیجہ آیا ہے، دو مضامین میں فیل ہوا ہے۔

ہارون: یہ تو واقعی بُری خبر ہے، لیکن وہ تو اچھا خاصا "پڑھاکو" بچہ تھا۔

جمشید: جب سے گھر میں کیبل آئی ہے، زیادہ تر وقت کیبل پر نشر ہونے والے پروگرام دیکھنے میں گزارتا ہے۔

ہارون: کیبل کے بے جا استعمال سے یہی تو نقصانات ہوتے ہیں، جو لوگ ضرورت سے زیادہ اس میں دل چسپی لیتے ہیں انھیں بالآخر ناکامی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔

جمشید: میں تو کہتا ہوں کہ کیبل نے ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے۔

ہارون: نہیں میرے بھائی! یہ کیبل کا قصور نہیں ہے بلکہ اس کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔

جمشید: وہ کیسے؟

ہارون: دیکھو بھئی! چھری میں کاٹنے کی صلاحیت ہے، چاہے اس سے پھل کاٹ لیں یا کسی کی گردن۔

جمشید: کیبل نے تو لوگوں سے فرصت کے لمحات چھین لیے ہیں۔ طالب علموں سے کتابیں چھین لی ہیں۔ پڑھائی کا شوق تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ سرِ شام ہی ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔

ہارون: اس میں بھی ہمارا ہی قصور ہے، ترقی یافتہ ممالک میں کیبل کے باوجود کسی قسم کا تعلیمی تعطل نہیں، طلبہ باقاعدگی سے اپنی پڑھائی میں دل چسپی لیتے ہیں، وہاں کیبل کی مدد سے معلوماتی لیکچرز اور اسباق کی تیاری میں معاونت لی جاتی ہے اور ہم کیبل پر صرف بھارتی فلمیں دیکھتے ہیں۔

جمشید: اس کیبل نے ہماری نئی نسل کو فحاشی، عریانی اور بے حیائی کے سوا دیا ہی کیا ہے۔ ہم اپنی تہذیب و تمدن سے دور ہو گئے ہیں۔ ہمارا کلچر مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ ہماری تہذیب میں آہستہ آہستہ بھارتی تہذیب سرایت کرتی جا رہی ہے۔ نوجوان نسل روزمرہ کی بول چال میں ہندی الفاظ کا استعمال کر رہی ہے۔ اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے۔

ہارون: لیکن کیبل پر چند چینلز ایسے بھی ہیں جن میں عریانی اور فحاشی کا نام تک نہیں بلکہ اسلام کے فروغ کے لیے کاوشیں ہو رہی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ایسے مفید چینلز سے استفادہ کریں۔

جمشید: لیکن جگہ جگہ کیبل کنکشن کی وجہ سے منی سینما ہاؤس کھل گئے ہیں جہاں عریاں اور فحش فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔ طلبہ تعلیمی اداروں کی بجائے منی سینما ہاؤس میں قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔

ہارون: والدین کو بھی اپنے بچوں کو اس بات کا احساس دلانا چاہیے کہ پڑھائی کے وقت پڑھائی اور تفریح کے وقت تفریح کو ترجیح دیں اور پڑھائی کو تمام معمولات میں اولیت دیں۔

جمشید: مہنگائی نے لوگوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ والدین روزمرہ اور بچوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دن رات مصروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کی مکمل نگرانی کر سکیں۔

ہارون: بہر حال: میری رائے ہے کہ تمھیں علی کو سمجھانا چاہیے۔ وہ پڑھائی کی طرف ضرور توجہ دے گا۔ اس کا نظام الاوقات بناؤ جس میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ تفریح کا وقت بھی ہو۔

جمشید: شکریہ ہارون! آپ نے بڑی مفید باتیں بتائیں اور مناسب رائے دی۔ میں علی کو ضرور سمجھاؤں گا۔

ہارون: اچھا بھائی جمشید! کافی دیر ہو گئی ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔

(دونوں دوست اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔)

38 ٹریفک کے بڑھتے ہوئے حادثات کے عنوان پر دو دوستوں کے درمیان مکالمہ

(لاہور بورڈ 2010ء، ڈیرہ غازی خان 2014ء، گوجرانوالہ، لاہور بورڈ 2015ء)

(اکرم اور یونس دونوں دوست ہیں۔ اکرم ڈرائنگ روم میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ اس کا دوست یونس اس کے پاس آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

یونس: السلام علیکم! کیا ہو رہا ہے؟

اکرم: وعلیکم السلام! اخبار پڑھ رہا ہوں۔

یونس: یار آج آپ بہت مغموم دکھائی دے رہے ہیں۔

اکرم: یہ دیکھو اخبار؟ آج پھر خان پور کے قریب گرلز کالج کی بس اور ٹریکٹر کے ٹکرانے سے بہت بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔ بیس سے زیادہ طالبات زخمی ہیں' جن میں سے اکثر کی حالت تشویش ناک ہے۔

یونس: یہ کوئی نئی خبر تو نہیں ہے۔ معمولات انسان کو عادی بنا دیتے ہیں۔ بقول شاعر:

شب و روز مجھے کوئی اک نیا دعا دیتا ہے
معمول انسان کو خوگر بنا دیتا ہے

اکرم: ٹھیک کہا تم نے! آج کل ہمارے ملک میں حادثات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ آئے روز کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔

یونس: بسوں کے ڈرائیور پہلے سواریاں اٹھانے کی کوشش میں اندھا دھند گاڑیاں چلاتے ہیں' جس کی وجہ سے ٹریفک کے حادثات پیش آتے ہیں۔

اکرم: بسوں کے مالک بھی تو گاڑیوں کے اسٹیئرنگ ہر کس و ناکس کے ہاتھ دے کر لوگوں کی جانوں سے کھیل رہے ہیں۔ ڈرائیوروں کے پاس لائسنس تک تو ہوتا نہیں۔

یونس: اگر ایسی بات ہے تو پھر یہ ٹریفک پولیس کس مرض کی دوا ہے کیوں نہیں پکڑتی بغیر لائسنس کی گاڑیاں چلانے والوں کو؟

اکرم: چیک کرتی ہے۔ تم نے ہر چوک پر کھڑے اپنے ہاتھ میں نوٹ بک پکڑے سارجنٹ کو تو دیکھا ہوگا۔ اگر اس کی مٹھی گرم کر دی جائے تو بغیر لائسنس کے سڑک پر اندھا دھند گاڑی چلاتے پھرو، کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔

یونس: بعض دفعہ تو لوگ ٹریفک پولیس کی بات سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اور نہ ان کے روکنے پر رُکتے ہیں، اکثر لوگ تو قوانین کی خلاف ورزی کرنے میں خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں۔

اکرم: جی ہاں! اس کے علاوہ ہمارے ملک میں بعض چھوٹے شہروں میں چلنے والی گاڑیاں بھی تو سو سال پرانی ہیں۔ ان کا بھی تو علاج ہونا چاہیے۔

یونس: اس کا علاج ہے' لیکن ٹریفک پولیس کے پاس۔ تم سو سال پرانی گاڑیوں کی بات کرتے ہو اگر ٹریفک پولیس کی حمایت حاصل ہو تو ہزاروں سال پرانی گاڑیاں بھی سڑکوں پر چل سکتی ہیں۔

اکرم: ملک کی سڑکیں بھی تو ٹوٹی پھوٹی اور دو طرفہ (سنگل) ہیں۔ صرف چند خاص سڑکوں کی مرمت ہوتی ہے' جہاں سے بڑے اور خاص لوگوں نے گزرنا ہوتا ہے۔

یونس: تمام سرکاری اہل کاروں، عوام اور حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنے حقوق و فرائض کو پہچانیں۔

اکرم: ٹیلی ویژن اور ریڈیو والوں کو بھی چاہیے کہ لوگوں میں ٹریفک قوانین کی پابندی کا شعور پیدا کریں' تب ہی یہ حادثات کم ہوں گے۔

یونس: بالکل ٹھیک کہا تم نے! خدا سب کو ہدایت دے اور تمام لوگوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

اکرم: آمین۔

یونس: اچھا بھائی! اکرم اب اجازت! دیر ہو رہی ہے میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ

اکرم: اللہ حافظ

(یونس اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

39 کتابی کیڑے اور کھیلوں کے رسیا کے درمیان مکالمہ

(بہاول پور بورڈ 2011، ڈیرہ غازی خاں 2019)

(عاطف اپنے گھر میں بیٹھا پڑھ رہا ہے۔ اس کا دوست اویس اس سے ملنے آتا ہے اور وہ یوں مخاطب ہوتا ہے۔)

اویس: السلام علیکم!

عاطف: وعلیکم السلام!

اویس: کیا حال ہے آپ کا؟

عاطف: اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنائیں کیسے آنا ہوا؟

اویس: بس ایک کام ہے۔

عاطف: کیا کام ہے؟

اویس: کام یہ ہے کہ آج شہر سے پانچ کلو میٹر دور کرکٹ کا ایک میچ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔

عاطف: کیا ہوا بھائی! کیا کھلاڑی پورے نہیں ہیں؟

اویس: جی ہاں! ایک کھلاڑی نہیں آیا۔

عاطف: جناب میں تو آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا کیوں کہ مجھے تو پڑھنا ہے۔

اویس: میں تو جب کبھی بھی آپ کو کھیل کے لیے بلاتا ہوں تو آپ انکار کر دیتے ہیں۔ آپ تو بالکل کتابی کیڑے بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن آپ بھی تو پورا دن کھیلتے رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے آپ کئی دفعہ ٹیسٹوں میں فیل ہو گئے ہیں۔

عاطف: یار کھیل صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے' یہ انسان کی زندگی کا ایک بہت اہم حصہ ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اویس: مگر جناب! تعلیم کی اہمیت سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا' تعلیم انسان کو شعور دیتی ہے۔ اس سے ان کا ذہن روشن ہوتا ہے۔ انسان ترقی کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ اگر انسان پڑھے نہ تو وہ علم کی دولت سے محروم رہتا ہے اور اگر انسان کے پاس علم نہ ہو تو اس کے وجود کا کوئی فائدہ نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے''

عاطف: آپ کی بات درست ہے مگر تعلیم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا ذہن توانا ہو اور ذہن کے تندرست ہونے کے لیے جسم کا تندرست ہونا بہت ضروری ہے اور کھیل ہی انسان کو ایک صحت مند جسم دے سکتا ہے۔

اویس: ہاں! میں آپ کی بات مانتا ہوں، دیکھیں آپ بھی تو مان گئے ہیں کہ تعلیم ضروری ہے۔

عاطف: ہاں! بس آپ کے دلائل نے مجھے اس بات کا قائل کر دیا۔ اچھا اب آپ مجھے بتائیں کہ آپ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہیں نا؟

اویس: جی ہاں! میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں مگر آپ وعدہ کریں کہ آپ بھی شام کو میرے ساتھ لائبریری میں مطالعہ کے لیے چلیں گے۔

عاطف: ہاں اچھی بات ہے، میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔

اویس: تو ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔

(دونوں دوست کھیل کے میدان کی طرف چل پڑتے ہیں۔)

40 دو دوستوں کے درمیان دہشت گردی کے موضوع پر مکالمہ

(گوجرانوالہ، ملتان، ڈی جی خان بورڈ 10، لاہور بورڈ 13، 18، ساہیوال 14، راولپنڈی 15، گوجرانوالہ۔ سرگودھا۔ ملتان بورڈ 16، آزاد کشمیر بورڈ 17، فنی بورڈ 18)

(آصف اور ناصر دونوں سالِ اول کے طالب علم ہیں۔ آصف کالج لائبریری میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ آصف کا ہم جماعت ناصر اس کے پاس آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

ناصر: السلام علیکم! کیا ہو رہا ہے؟

آصف: وعلیکم السلام! اخبار پڑھ رہا ہوں۔

ناصر: یار آصف! آج آپ بہت مغموم دکھائی دے رہے ہیں۔

آصف: یہ دیکھو اخبار، کراچی میں پھر خودکش بم دھماکہ ہوا ہے۔

ناصر: یہ کوئی نئی خبر یا کوئی ان ہونی بات نہیں، معمولات انسان کو عادی بنا دیتے ہیں۔

آصف: پہلے تو تم ملکی حالات سے اتنے بے نیاز نہ تھے۔

ناصر: بے نیاز تو اب بھی نہیں ہوں۔ بس بے بسی انسان کی زبان پر قفلِ سکوت لگا دیتی ہے۔

آصف: تشویش ناک امر یہ ہے کہ ملک میں دہشت گردی کا دائرہ کار روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

ناصر: پوری دنیا میں یہ ایک متنازعہ مسئلہ بن گیا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، طالبان، القاعدہ، حرکۃ المجاہدین سب ایک دوسرے کو دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔

آصف: چند برس قبل دہشت گردی کو اتنا عروج نہیں تھا، لیکن نائن الیون کے واقعات کے بعد اس میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ پھر خودکش دھماکوں جیسی گھناؤنی واردات میں ملوث ہونا انتہائی قبیح فعل ہے۔

ناصر: جی ہاں! خودکش دھماکے صریح خون ریزی ہے، خاص طور پر بے چارے معصوم لوگوں کی زندگیوں سے یوں کھیلنا انسانیت کا قتل ہے۔

آصف: بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تقریباً پندرہ برس سے بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

ناصر: حد تو یہ ہے کہ تعلیمی ادارے، مساجد، مزارات، مدارس اور مقدس مقامات تمام دہشت گردوں کی زد میں ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حملہ آور کس لالچ میں آ کر جان دیتے ہیں۔

آصف: دراصل یہ تمام لوگ دشمن ممالک کے زرخرید ہوتے ہیں۔

ناصر: لیکن جان کے سامنے دولت کی کیا حیثیت ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔

آصف: یہ تمھارا خیال ہے۔ غربا، جن کا دُہرا استحصال ہو رہا ہے، غربت، مہنگائی اور طرح طرح کے مسائل نے جن کی کمر توڑ دی ہے حوادثِ زمانہ اور حالات کے ستائے ہوئے یہ لوگ زندگی کی بجائے موت کو گوشۂ عافیت سمجھتے ہیں۔

ناصر: کیا مساجد و دیگر مقدس مقامات پر کوئی مسلمان بھی حملہ کر سکتا ہے؟

آصف: جی ہاں! حالات کے ستائے ہوئے بے روزگار نوجوان اور عاقبت نااندیش مذہبی جنونی ہوتے ہیں، جو کہ ایسے گھناؤنے فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ناصر: کیا پاکستان میں بھی غیر مسلم ممالک ایسی گھناؤنی کارروائیوں میں ملوث ہیں؟

آصف: جی ہاں! یہ ممالک پاکستان کے کھلے دشمن ہیں، یہ متعصب ممالک کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں سے واحد ایٹمی طاقت پاکستان مضبوط تر ہو۔

ناصر: ہمارے ملک میں کوئی بھی خودکش حملہ یا دہشت گردی کی واردات ہو تو موردِ الزام مذہبی حلقوں کو ہی کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟

آصف: غیر مسلم ممالک دراصل اسلام کے دشمن ہیں اور مدارس اسلام کے قلعے ہیں۔ اس لیے وہ پاکستانی عوام کو مدارس سے متنفر کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کا تعلق مساجد اور مدارس سے منقطع ہو جائے اور اسلام کے قلعے یعنی مدارس کو فتح کر لیں کیوں کہ جب کسی ملک کا قلعہ فتح ہو جاتا ہے تو ملک بھی فتح ہو جاتا ہے۔

ناصر: غیر مسلم ممالک اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے بعض مسلمانوں کو بھی تو استعمال کر رہے ہیں۔

آصف: جی ہاں! یہ عقل کے اندھے اسلام کے دشمنوں کے مفاد کی خاطر اپنے ملک و قوم کی تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔

ناصر: کیا ہمارے مذہب اسلام میں اس طرح قتلِ عام کی گنجائش ہے؟

آصف: بالکل نہیں! ہمارا مذہب امن اور سلامتی کا مذہب ہے، اس میں تو کافر کو بھی ناحق قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ناصر: دشمن ممالک کو مساجد اور مذہبی جلسوں پر حملے کروا کے کیا ملتا ہے؟

آصف: یوں مذہبی گروہ ایک دوسرے سے متنفر ہو کر آپس میں دست و گریبان ہو جاتے ہیں اور ملک داخلی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔

ناصر: دہشت گردی کے اس سیلاب کے سامنے ہمیں بند باندھنا ہوگا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سیلاب پوری قوم کو خس و خاشاک کی طرح صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دے۔

آصف: جی ہاں! حکومت کو چاہیے کہ ویزوں کے اجرا کے وقت کڑی تحقیق کرے، خاص طور پر غیر ممالک سے آنے والوں کے مکمل کوائف کی پڑتال کرے اور اس کے بعد اُن کی اندرونِ ملک سرگرمیوں پر بھی نظرِ غائر رکھی جائے۔

ناصر: دہشت گردی کی روک تھام کے لیے حکمران کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

آصف: ہمارے حکمرانوں کو چاہیے کہ دوست دشمن کی پہچان کریں۔ خاص طور پر وہ ممالک جو کہ مسلمانوں کے کھلے دشمن ہیں، کی حمایت

کرنا چھوڑ دیں تو اس سے ملک کی مذہبی جماعتیں اعتماد میں آ جائیں گی اور دشمن ممالک کو ملک سے خودکش حملہ آوروں کا حصول بہت مشکل ہو جائے گا۔

ناصر: اس کے علاوہ عوام الناس کی کیا ذمہ داری ہے؟

آصف: عوام کو چاہیے کہ جہاں کہیں کوئی مشکوک فرد، کوئی لاوارث بیگ وغیرہ ملے فوراً پولیس کو اطلاع دیں۔

ناصر: یار آصف! آپ کے بیان کردہ اصل حقائق نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اللہ آپ کے علم میں برکت دے۔

آصف: دعا کرو ناصر! اللہ تعالیٰ ہماری قوم کے حالِ زار پر رحم فرمائے۔

ناصر: آمین

آصف: اب ہمیں چلنا چاہیے کیوں کہ اُردو کا لیکچر شروع ہوا چاہتا ہے۔

(دونوں دوست جماعت کے کمرے کی طرف چل پڑتے ہیں۔)

41 والدین کا اولاد کے رویوں پر مکالمہ

(ایک ہی محلے سے تعلق رکھنے والے دو دوست ابرار اور نصر اللہ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے باہر آتے ہیں اور دونوں سیر کے لیے روانہ ہوتے ہوئے یوں ہم کلام ہوتے ہیں۔)

نصر اللہ: السلام علیکم! ابرار صاحب! سنائیں کیا حال ہے؟

ابرار: وعلیکم السلام! اللہ کا شکر ہے۔ میں ٹھیک ہوں آپ سنائیے؟

نصر اللہ: میں بھی ٹھیک ہوں۔ آج آپ کا بڑا بیٹا نماز کے لیے نہیں آیا، خیریت تو ہے؟

ابرار: رات دیر تک جاگتا رہا، اس لیے صبح بیدار نہیں ہو سکا۔

نصر اللہ: آپ نے بھی نہیں جگایا؟

ابرار: کوشش کی تھی۔

نصر اللہ: صرف کوشش؟ یوں کہیے ناکام کوشش۔

ابرار: دراصل وہ رات دیر تک کمپیوٹر کا استعمال کرتا رہا۔ علی الصبح اس کے لیے جاگنا مشکل تھا اور میرے لیے بھی اسے جگانا مشکل تھا۔

نصر اللہ: بہت خوب۔۔۔۔ اس عمر میں کون سا کاروبار کر رہا ہے کمپیوٹر پر آپ کا صاحب زادہ؟

ابرار: گیمز۔ دوستوں کے ساتھ بات چیت۔

نصر اللہ: دوسرے لفظوں میں وقت کا ضیاع۔ (مسکراتے ہوئے) آپ اسے منع بھی نہیں کرتے؟

ابرار: بالکل نہیں۔ میرا خیال ہے کمپیوٹر سے بچے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ اس لیے میں اسے منع نہیں کرتا۔

نصر اللہ: کیا ہم والدین کے پاس سکھانے کے لیے باتیں ختم ہو گئی ہیں کہ ہم نے اپنی اولاد کو کمپیوٹر کے سپرد کر دیا ہے؟

ابرار: لیکن جو کمپیوٹر سکھا سکتا ہے وہ ہم تو نہیں سکھا سکتے اور یہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

نصر اللہ: آپ کی بات بجا لیکن اس ناپختہ عمر میں کیا بچے کمپیوٹر کا ویسا ہی استعمال کرتے ہیں جیسا ہم چاہتے ہیں؟ کیا ہماری اولاد سے متعلق ذمہ داریاں یہیں ختم ہو جاتی ہیں؟

ابرار: آپ کہنا کیا چاہتے ہیں بھائی صاحب؟ صاف کہیے نا۔

نصر اللہ: اگر کمپیوٹر ہی تربیت کا ذریعہ ہے تو پھر وہ صبح کے وقت نماز کے لیے آپ کے بیٹے کو کیوں نہیں جگا سکا؟

ابرار: ہاں! یہ تو ہے۔

نصر اللہ: پہلے زمانے میں بزرگ بچوں کو اپنے اردگرد جمع کر لیا کرتے، انھیں دین کی سوجھ بوجھ دیتے اور ان کی تربیت کرتے تھے لیکن آج کی نسل ان صحبتوں سے محروم ہے افسوس کہ:

ہم جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے — اب اس پیڑ کے پتے جھڑتے جاتے ہیں (ناصر کاظمی)

ابرار: پھر ہم والدین کو کیا کرنا چاہیے؟

نصراللہ: ہمارا فرض ہے کہ ہم انھیں سچا مسلمان بنائیں۔

ابرار: کیسے بنا سکتے ہیں؟

نصراللہ: دیکھو بھائی اولاد والدین کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہوتی ہے اور اگر اولاد نیک ہو تو وہ اپنے والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی تربیت ہماری ذمہ داری ہے۔ تربیت کے ذریعے اچھا مسلمان بنا سکتے ہیں۔

ابرار: ہاں جانتا ہوں یہ واقعی آزمائش ہے مگر ہم اس آزمائش پر کیسے پورا اتر سکتے ہیں؟

نصراللہ: بہت آسان ہے۔

ابرار: آسان کیسے؟

نصراللہ: جو نصیحت ہم اپنی اولاد کو کرتے ہیں پہلے ہم خود اس پر عمل پیرا ہوں، کیوں کہ انسان کا عمل دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ چناں چہ ہمیں اپنی اولاد کی بہتر تربیت کے لیے ایک مثالی ماحول فراہم کرنا ہوگا۔

ابرار: میں سمجھا نہیں۔ ہم اولاد کو مثالی ماحول کیسے فراہم کر سکتے ہیں؟

نصراللہ: ہم اپنے گھروں میں دینی ماحول پیدا کریں کیوں کہ انسان ماحول سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ہم اپنے گھروں کا مثالی ماحول بنا کر بچوں کی بہتر تربیت کر سکتے ہیں۔

ابرار: والدین کے علاوہ یہ ضرورت اور کون پوری کر سکتا ہے؟

نصراللہ: مخلص اور دین دار دوست۔ جو فی زمانہ کم یاب ہیں۔

ابرار: پھر تو والدین کو ہی یہ ضرورت پوری کرنی چاہیے۔ وہی سب سے بڑے خیر خواہ ہو سکتے ہیں اپنے بچوں کے۔

نصراللہ: جی ہاں!

ابرار: مگر یار اولاد پر بے جا رعب بھی تو ان کو باغی بنا دیتا ہے۔

نصراللہ: ہاں اعتدال کا راستہ بہترین راستہ ہے۔

ابرار: آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

نصراللہ: آج کے پُرفتن دور میں والدین کو اولاد کی تربیت پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اولاد کو باہر کے ماحول سے بچا کر دین کے ماحول میں لانا ہوگا، کیوں کہ دین کے ماحول میں ہی دین پر چلنا آسان ہوتا ہے۔

ابرار: میں تو سمجھتا تھا بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر بنا دینا ہی اصل ذمہ داری ہے۔ مگر۔۔۔۔۔

نصراللہ: ڈاکٹر اور انجینئر بھی ضرور بنائیں۔ یہ بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن اپنے دین کو خیر باد نہ کہیں۔

علامہ اقبال نے بجا فرمایا ہے کہ:

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ۔۔۔ ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

ابرار: نصراللہ بھائی! ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

نصراللہ: ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی آخرت کی زندگی کو محفوظ بنائیں جو کہ زیادہ اہم ہے۔ اللہ خود قرآن مجید میں فرماتے ہیں کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (سورۃ التحریم:6) ترجمہ: اے ایمان والو اتم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

ابرار: ہمارے دور اور موجودہ دور کی نوجوان نسل کے مزاج اور رویوں میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے دور میں رشتوں کا تقدس تھا۔ چھوٹے بڑوں کا احترام کرتے تھے۔ مگر موجودہ دور ایسی خوبیوں سے محروم ہے۔

نصراللہ: جی ہاں بھائی صاحب۔ آج کا دور بہت مصروف ہے۔ ہر انسان کی بے پناہ مصروفیات ہیں۔ مصروفیت کے باعث والدین کے پاس اولاد کی تربیت کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس لیے والدین نے اولاد کو کیبل، موبائل فون اور کمپیوٹر کے حوالے کر دیا ہے۔

ابرار: ہاں بھئی میں جب اپنے معمولات پر غور کرتا ہوں تو میرے پاس بھی اولاد کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں نے بھی اپنی اولاد کو کیبل اور کمپیوٹر کے حوالے کر دیا ہے۔

نصراللہ: اصل میں انسان تربیت کا محتاج ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انبیا کو انسانوں کی تربیت کے لیے مبعوث فرمایا اور ہر دور کے نبی نے انسانوں کی تربیت کی ہے۔

ابرار: جی بھائی صاحب۔ واقعی انسان تربیت کا محتاج ہے۔ میں جب اپنے بڑے بیٹے کا لباس، حلیہ اور گفتگو کا انداز دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے بیٹے کے رویے سے مایوسی ہوتی ہے۔

نصراللہ: ہم والدین کا فرض تھا کہ اپنی اولاد کی تربیت اسلام کے مطابق کرتے، جب کہ ہم نے انھیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا تعلق دینے کی بجائے انھیں غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے حوالے کر دیا۔ اب کا نتیجہ نکل آئے ہیں اور بے ادبی سے بات کرتے ہیں تو افسوس کرتے ہیں۔

ابرار: اللہ آپ کا بھلا کرے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔

نصراللہ: اللہ آپ کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ابرار: چلیے گھر چلتے ہیں۔

(دونوں دوست اپنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔)

42 دو طالب علموں کے درمیان ٹیوشن سنٹر اکیڈمی کے فوائد و نقصانات کے موضوع پر مکالمہ

(لاہور بورڈ 2014-15)

(عدنان اور دانش دوست ہیں اور ایک ہی محلہ میں رہتے ہیں۔ دانش کتاب لینے کے لیے عدنان کے گھر آتا ہے۔ دونوں میں گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔)

دانش: السلام علیکم!

عدنان: وعلیکم السلام! کیا حال ہے؟

دانش: الحمدللہ! میں ٹھیک ہوں۔ انگلش پارٹ ون کا خلاصہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ وہ دے دیں۔

عدنان: لگتا ہے کہ بہت جلدی میں ہو۔ کہاں جا رہے ہو؟

دانش: ٹیوشن سنٹر جا رہا ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔

عدنان: ایسی بھی کیا جلدی یار! آپ تو عید کا چاند بن گئے ہیں۔ ملاقات ہی نہیں ہوتی آپ سے۔

دانش: بس یار کیا بتاؤں، والد صاحب نے ٹیوشن سنٹر میں داخل کرا دیا ہے۔ اب تو سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ رات دن پڑھائی کی مصروفیت ہے۔

عدنان: پڑھائی کی اہمیت اپنی جگہ مگر آرام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

دانش: آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ کالج سے آتے ہی فوراً ٹیوشن سنٹر چلا جاتا ہوں۔ وہاں سے واپسی پر پڑھی ہوئی چیزیں دہراتا ہوں۔

عدنان: یہ تو پھر ٹیوشن سنٹر نہیں بلکہ ''ٹینشن سنٹر'' ہو گیا ہے۔ کیا آپ کے کالج میں پڑھائی نہیں ہوتی؟

دانش: کالج میں تو بہت ہی قابل اور سینئر پروفیسر صاحبان ہیں، جو بڑی محنت سے پڑھاتے ہیں۔

عدنان: تو پھر ٹیوشن سنٹر کا بکھیڑا پالنے کی کیا ضرورت ہے کہ نہ نماز کا وقت ملتا ہے اور نہ ہی آرام و سکون کا۔

دانش: دراصل گھر میں پڑھا نہیں جاتا اس وجہ سے والد صاحب نے اکیڈمی میں داخل کرا دیا ہے، تاکہ سارا وقت پڑھائی میں صرف ہو۔

عدنان: ٹیوشن تو وہ پڑھے جو کند ذہن ہو۔ اگر آپ کو پڑھائی سے دل چسپی نہ ہو تو ٹیوشن سنٹر والے بھی آپ کو گھول کر پلانے سے تو رہے۔

دانش: کیا آپ ٹیوشن نہیں پڑھتے؟

عدنان: بالکل نہیں! اور الحمدللہ مجھے تو پڑھائی میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ آرام بھی کرتا ہوں اور وقت پر نماز باجماعت بھی ادا کرتا ہوں۔ میری تعلیمی کیفیت بھی آپ کے سامنے ہے۔

دانش: تعلیمی کیفیت کے حوالے سے تو ماشاءاللہ آپ کی بہترین کارکردگی ہوتی ہے۔

عدنان: میرا مشورہ تو یہی ہے کہ کالج میں پڑھے جانے والے اسباق کو گھر پر آ کر دہرا لیا کرو اور اگر ان میں کوئی مشکل پیش آئے تو دوسرے دن اساتذہ سے پوچھ لو۔

دانش: یعنی آپ کی تجویز یہ ہے کہ میں ٹیوشن سنٹر جانا چھوڑ دوں۔

عدنان: آپ میری بات کا بالکل صحیح مطلب سمجھے ہیں اور ویسے بھی ٹیوشن سنٹر جا کر پلے کچھ نہیں پڑتا، بلاوجہ وقت اور روپیا ضائع ہوتا ہے۔

دانش: محترم! جب آپ اکیڈمی جاتے ہی نہیں تو پھر کیوں کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ پلے کچھ نہیں پڑتا۔

عدنان : میں نے بھی ان اکیڈمیوں کی خاک چھانی ہوئی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کالج میں مضامین کے موضوعات کچھ اور ہوتے ہیں جب کہ اکیڈمی میں کچھ اور، اس لیے نہ تو کالج کی تدریس سمجھ میں آتی ہے اور نہ ہی ٹیوشن سنٹر میں کچھ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

دانش : ہاں! یہ بات تو آپ کی کافی حد تک درست لگ رہی ہے۔

عدنان : صرف موضوعات ہی نہیں، اساتذہ بھی مختلف ہوتے ہیں اور یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ جہاں بہت سے کاری گر کسی عمارت کو بنانے پر تل جائیں اور ہر ایک اپنی من مانی سے کام لے تو عمارت کا حلیہ ہی بگاڑ دیں گے۔

دانش : ٹھیک ہے میں مانتا ہوں کہ اکیڈمی میں پڑھنے کے چند ایک نقصانات ہیں اور آپ کی باتیں کچھ حد تک ٹھیک ہیں لیکن آپ ٹیوشن سنٹر کے مثبت پہلوؤں پر بھی ذرا غور فرمائیں تاکہ انصاف کا توازن برقرار رہے۔

عدنان : میں نے تو صاف بتا دیا ہے کہ ٹیوشن سنٹر دراصل ٹینشن سنٹر ہیں۔ جو ''دور کے ڈھول سہانے'' کے مصداق پر کشش ہوتے ہیں مگر فائدہ کچھ نہیں۔

دانش : آپ کے پرخلوص مشورے کا شکریہ! میں آپ کی معلومات کے لیے عرض کر دوں کہ ایسے ایسے کمزور اور کند ذہن بچے جن کو کچھ بھی یاد نہیں ہوتا تھا ٹیوشن سنٹر میں اساتذہ کی بھرپور محنت سے امتحان میں پاس ہو گئے۔

عدنان : یہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ٹیوشن سنٹر وہ پڑھے جو کند ذہن ہو۔

دانش : جی نہیں! اس کے علاوہ بھی ٹیوشن سنٹر کے بہت سے فوائد ہیں۔ اگر آپ سننا پسند کریں تو میں کچھ عرض کروں۔

عدنان : بالکل بتا سکتے ہیں۔ اگر آپ کی بات درست ہوگی تو ماننے میں کوئی حرج نہیں۔

دانش : پہلی بات تو یہ ہے کہ ٹیوشن سنٹر میں امتحانی نقطہ نظر سے تیاری کرائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیوشن سنٹر میں ٹیسٹ سسٹم بڑا منظم ہوتا ہے۔ اساتذہ جو ٹیسٹ لیتے ہیں جلد ہی چیک کر کے واپس بھی دے دیتے ہیں، جس سے طلبہ کو اپنی غلطیوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

عدنان : تو کیا کالج میں تسلی بخش طریقے سے نہیں پڑھایا جاتا؟

دانش : آپ میری بات سمجھ نہیں رہے۔ میں کالج کی برائی بیان نہیں کر رہا بلکہ ٹیوشن سنٹر کے فوائد سے آپ کو آگاہ کر رہا ہوں۔

عدنان : ٹھیک ہے! آپ اپنی بات جاری رکھیں۔

دانش : جو طلبہ کسی مجبوری کی وجہ سے کالج میں کلاس لینے سے قاصر ہو جائیں تو وہ ٹیوشن سنٹر میں پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر امتحان میں کوئی مضمون رہ جائے تو ٹیوشن سنٹر میں تیاری کر سکتے ہیں۔

عدنان : (قائل ہونے کے انداز میں سر ہلاتا ہے) واقعی یہ مثبت پہلو تو میری نظروں سے اوجھل تھے۔

دانش : آگے سنیے! کالج میں نصاب مکمل ہونے کے بعد جب تعلیمی سیشن ختم ہو جاتا ہے تو ٹیوشن سنٹر میں پڑھنا زیادہ مفید ہوتا ہے کیوں کہ امتحان کے قریب طالب علم یک سوئی اور توجہ سے امتحان کی تیاری کر لیتا ہے۔

عدنان : دلائل تو واقعی آپ کے زبردست ہیں۔

دانش : شکر ہے! آپ کو میری بات سمجھ تو آ گئی۔ پھر کب داخلہ لے رہے ہیں ٹیوشن سنٹر میں؟

عدنان : فی الحال تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دیکھیں گے۔

دانش : اچھا بھائی عدنان! اب مجھے اجازت دیں۔ اللہ حافظ

عدنان : اللہ حافظ

(دانش کتاب لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔)

43 دوستوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات کے عنوان پر مکالمہ

(گوجرانوالہ 2018)

(احسان اور اکرام دونوں دوست ہیں اور ایک ہی محلّہ میں رہتے ہیں۔ چھٹی کا دن ہے۔ اکرام احسان کے پاس آتا ہے اور دونوں میں گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔)

اکرام : السلام علیکم!

احسان : وعلیکم السلام، آیئے جناب، کیسے ہیں؟

اکرام : میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن آپ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار کیوں نظر آ رہے ہیں؟ آپ نے شاید آج کا اخبار نہیں پڑھا۔

احسان : میں تو ناشتہ سے فارغ ہو کر آپ کے پاس چلا آیا، کوئی خاص خبر ہے کیا؟

اکرام : (ایک سرد آہ بھرتے ہوئے) بس اللہ تعالیٰ ہی ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہدایت دے۔

احسان : بھائی صاحب! کچھ بتاؤ گے بھی سہی یا یوں ہی ٹال مٹول سے کام لیتے رہو گے۔

اکرام : وہی فرقہ ورانہ فسادات کی خبر ہے جو آئے دن اخباروں کی زینت بنتی رہتی ہے۔

احسان : یہ تو واقعی افسوس ناک خبر ہے۔

اکرام : یہ لیں اخبار آپ خود ہی پڑھ لیں کہ ہم مسلمانوں کے باہمی اختلافات کہاں تک پہنچ گئے ہیں؟

احسان : (اخبار پڑھتے ہوئے) دس بے گناہ افراد فرقہ ورانہ فسادات کی بھینٹ چڑھ گئے۔

اکرام : اب کچھ ہی دنوں بعد مخالف فرقے سے تعلق رکھنے والوں سے بدلہ لیا جائے گا۔

احسان : دراصل کچھ بیرونی قوتیں اس سازش میں ملوث ہیں تاکہ مسلمان آپس میں لڑتے مرتے رہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے ایجنٹوں کو ہماری صفوں میں داخل کیا ہوا ہے۔

اکرام : آپ کو تو ہر بات میں بیرونی سازش نظر آتی ہے۔ جہاں کوئی دھماکہ ہوتا ہے تو آپ کا مؤقف یہی رہا ہے کہ کسی دشمن ملک کی سازش ہے۔

احسان : صاف اور سیدھی بات ہے کہ ہمارا مذہب اسلام تو ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر حملے کریں اور قتل و غارت کا بازار گرم کریں۔

اکرام : لیکن یہاں تو مسلمان ہی مسلمان کو مار رہا ہے۔

احسان : یہی تو ہمارا المیہ ہے جس کی وجہ سے ہم مسائل سے دوچار ہیں۔ دکھ کی بات تو ہے کہ ہر گروہ اپنے خود ساختہ فرقہ کو اسلام سے زیادہ معتبر سمجھتا ہے اور دوسری وجہ کچھ سازشی عناصر بھی فرقہ واریت کو ہوا دے رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کی اجتماعیت ختم ہو جائے اور وہ آسانی سے اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔

اکرام : حالاں کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے واضح ارشاد فرما دیا ہے کہ ترجمہ: ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کرتے رہو اور آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمھارا رعب جاتا رہے گا'' (سورۃ الانفال:46)

احسان : آپ نے بالکل درست فرمایا ہے کیوں کہ جب ہمارا خدا ایک ہے، قرآن پاک ایک ہے اور ہم سب حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی امت ہیں، تو ہم مسلمان ایک کیوں نہیں ہیں۔

اکرام : علامہ اقبالؒ نے بجا فرمایا تھا کہ:

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

احسان : میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے موجودہ مسائل میں اس وقت سب سے بڑا مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات ہیں، جن کی وجہ سے قتل و غارت اور خون ریزی ہو رہی ہے۔

اکرام : اختلافی مسائل تو قیام پاکستان سے پہلے بھی تھے لیکن یوں فسادات کا سلسلہ نہیں ہوتا تھا۔

احسان : اختلاف رائے بذات خود کوئی ایسی انوکھی یا بری بات نہیں ہے بلکہ مستحسن ہے بشرطیکہ اختلاف رائے کو فتنہ و فساد کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

اکرام : اختلاف رائے تو صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی ہوا لیکن اس معاملے پر کبھی فساد نہیں ہوا تھا۔

احسان : اس معاملے میں علما کرام کا فرض بنتا ہے کہ وہ افہام و تفہیم سے اختلافی مسائل کا حل نکالیں اور عوام الناس میں اشتعال انگیزی کو پھیلنے سے روکیں۔

اکرام : بس بھائی! آج پورا کفر عالم اسلام کے خلاف ''الکفر ملۃ واحدۃ'' کی مثال بن کر مسلمانوں کو مٹانے کی غرض سے اکٹھا ہو چکا ہے اور ہمیں آپس کے جھگڑوں سے فرصت نہیں۔

اکرام : بات صرف جھگڑوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ گالی سے گولی تک کا سفر کرتی ہوئی بم بارود تک پہنچ چکی ہے۔ اور جہاں کہیں بم دھماکہ یا فائرنگ وغیرہ ہوتی ہے بعد میں شواہد سے پتا چلتا ہے کہ غیر ملکی اسلحہ یا بارودی مواد استعمال ہوا ہے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کفریہ طاقتیں ہر محاذ پر مسلمانوں کے خلاف لڑ رہی ہیں۔

احسان : مسلمانوں کو چاہیے کہ سمجھ داری سے کام لیں اور باہمی اختلافات بھلا کر متحد ہو جائیں۔

اکرام : (آہ سرد بھر کر) کاش ایسا ہو جائے۔ کیوں کہ اتحاد و اتفاق ہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے۔

احسان : اب بھی وقت ہے کہ ہم اتحاد کی ضرورت محسوس کر کے سنبھل جائیں ورنہ فرقہ واریت کی آگ مزید بھڑکے گی اور سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

اکرام : فرقہ واریت ایک زہر کی مانند ہے جو بڑی تیزی سے اسلامی دنیا میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔

احسان : آپ کے خیال میں اس کا کیا حل ہے؟

اکرام : ہمیں چاہیے کہ اگر کسی مسئلے میں اختلافِ رائے ہو گیا ہے تو اس کو قرآن پاک کے احکامات کی روشنی میں حل کریں۔ مزید تفصیل کی ضرورت ہے تو احادیث نبوی ﷺ سے رہنمائی حاصل کریں۔ علما کرام اپنا کردار ادا کریں اور دشمنوں کی سازشوں کو سمجھیں۔

احسان : موجودہ حالات کو دیکھ کر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ بقول علامہ اقبالؒ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اکرام : یہ تو حقیقت ہے کہ ہماری پستی اور زوال کی بڑی وجہ قرآن پاک کی تعلیمات سے انحراف ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ **"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ "** (سورۃ الحجرات:10) ترجمہ: **"بے شک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"**۔ لیکن ہم فروعی اختلافات کی وجہ سے آپس میں دست و گریبان ہیں۔

احسان : ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟

اکرام : ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں فتنہ و فساد سے بچا اور ہمارے ملک کو امن کا گہوارا بنا اور ہمیں کفریہ طاقتوں کی سازشوں سے محفوظ فرما۔

احسان : آمین

(اکرام، احسان سے اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

44 دو دوستوں کے درمیان اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کے بارے میں مکالمہ

(سرگودھا بورڈ، 2014ء)

(ارسلان اور کامران دونوں دوست ہیں۔ کامران اپنے دوست ارسلان سے ملنے اس کے گھر آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے)

کامران : السلام علیکم!

ارسلان : وعلیکم السلام! آؤ کامران بھائی کیسے ہو؟

کامران : ٹھیک ہوں! الحمدللہ۔ آپ سناؤ کیا ہو رہا ہے، آج کل؟

ارسلان : کیا ہونا ہے، بی اے کیے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ کوئی ملازمت ہی نہیں مل رہی۔ ایسی تعلیم کا فائدہ؟

کامران : یعنی آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا تعلیم حاصل کرنا بے کار ہے۔

ارسلان : ہاں تو اور کیا؟ ہر روز نوکری کے لیے گھر سے نکلتا ہوں مگر "ایں خیال است و محال است" اس وقت بھی اخبار میں ملازمت کے اشتہار دیکھ رہا تھا۔

کامران : مایوسی کی باتیں اچھی نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم کی دولت دی ہے اس کی قدر کریں۔

ارسلان : اس سے تو بہتر تھا کہ میں کوئی ہنر سیکھ لیتا، آپ دیکھیں گے کہ کالج کے گیٹ پر "سموسے پکوڑے" کی ریڑھی لگاؤں گا اور اس پر بورڈ لگاؤں گا "بی اے سموسے پکوڑے والا"

کامران : دراصل ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم حصولِ علم کو صرف ذریعۂ ملازمت سمجھتے ہیں اور ہماری سوچ محدود ہوتی ہے۔ حالاں کہ علم حاصل کرنا تو بہت بڑی سعادت ہے جس کی قرآن و حدیث میں بھی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

ارسلان : مشاہدہ تو یہی ہے کہ زیادہ تر تعلیم یافتہ بے روزگار ہیں۔

کامران : آپ کی سوئی دماغ میں ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی ہے۔ آج کا نوجوان سمجھتا ہے کہ جیسے ہی تعلیم سے فارغ ہو فوراً کوئی بڑا افسر بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے پانی بھر کر پینا بھی توہین سمجھتا ہے۔

ارسلان : آپ اپنی بات کی کچھ وضاحت کریں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

کامران : میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ سمجھ کر لوگ علم حاصل کرنا چھوڑ دیں کہ ملازمت مشکل سے ملتی ہے تو کیا ہمارا ملک ترقی یافتہ ہو جائے گا۔

ارسلان : جہالت سے تو تنزلی ہی ہو گی۔

کامران : اعلیٰ تعلیم کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے، کسی بھی ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر کی مثال ہمارے سامنے ہے جنھوں نے ملک کو ایٹمی طاقت بنا دیا۔ یہ ان کی اعلیٰ تعلیم کی بدولت ہی ممکن ہوا۔

ارسلان : واقعی وہ تو ہمارے لیے بہت قیمتی اثاثہ ہیں۔

کامران : اسی طرح آپ قائداعظم کی زندگی سے سبق حاصل کریں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، جس کی بدولت پاکستان کے حصول کے لیے کوشش کی، جس کے نتیجے میں آج ہم آزاد اسلامی ملک کے شہری ہیں۔

ارسلان : وہ تو بہت عظیم اور بڑے لوگ تھے۔

کامران : انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی جس کی بدولت وہ ایک عظیم انسان بن کر دنیا کے سامنے آئے اور موجودہ دور تو جدید ٹیکنالوجی اور سائنس کا دور ہے، اگر ہم نے تعلیمی میدان میں سستی دکھائی تو پھر **"ہماری داستان تک نہ ہو گی داستانوں میں"**

ارسلان : اس وقت تو اہل مغرب ہی جدید علوم و ٹیکنالوجی کے اعتبار سے ہم پر حاوی ہیں۔

کامران : جب سے ہم نے اپنے آباؤ اجداد کے علوم سے ناتا توڑا ہے تو زوال کا شکار ہو گئے ہیں اور اہل مغرب اعلیٰ تعلیم کی بدولت بامِ عروج پر پہنچ گئے ہیں۔ ایجادات و اختراعات ان کے دامن میں گرتی چلی گئیں اور وہ دنیا میں اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ارسلان : آپ کے خیال میں اہلِ مغرب کا ہم پلہ ہونے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

کامران : سیدھی سی بات ہے کہ جس طرح ایک سپاہی اسلحہ کے بغیر جنگ نہیں لڑ سکتا، اسی طرح ہم بھی اس جدید دور اور ترقی یافتہ دنیا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کیے بغیر اقوامِ عالم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔

ارسلان آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے ماضی کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمان ہر میدان میں بامِ عروج پر تھے۔

کامران : بلاشبہ یہ سب اعلیٰ تعلیم کی بدولت تھا، بغداد، کوفہ، قرطبہ، بصرہ، قاہرہ اور دیگر کئی شہر علوم و فنون کا گہوارا رہے ہیں اور اسلام کی عظمت کا ڈنکا بجتا رہا اور مسلمانوں میں بڑے بڑے مفکر اور سائنس دان گزرے ہیں۔

ارسلان : یقیناً ہماری غفلت ہی ہمیں بہت پیچھے لے گئی ہے۔

کامران : آج کا انسان تو جدید علوم اور اعلیٰ تعلیم کی بدولت چاند پر پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سائنس کے میدان میں اپنی برتری اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کارکردگی دکھائیں۔

ارسلان : آپ کی باتوں نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔

کامران : جب کہ ہم اپنی تعلیمی ترقی کی معراج ملازمت کے حصول کو سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ آپ ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے۔

"جو شخص علم کی طلب کے لیے (اپنے گھر سے) نکلا تو جب تک وہ لوٹ نہ آئے اللہ عزوجل کی راہ میں ہے" (مشکوٰۃ المصابیح)

ارسلان : یقیناً! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

کامران : اعلیٰ تعلیم کی بدولت انسان کی زندگی میں بے شمار سہولیات آ گئی ہیں۔ کمپیوٹر کو دیکھیں سرکاری و نجی شعبوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اسی طرح ایک ڈاکٹر اپنی اعلیٰ تعلیم کی بدولت کتنے لوگوں کی زندگی بچاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک ان پڑھ اور پڑھا لکھا شخص برابر نہیں ہو سکتے۔

ارسلان : آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اتنی مفید باتیں بتائیں۔

کامران : تو پھر پکوڑے، سموسے کب کھلا رہے ہیں؟

ارسلان : بھائی رزق تو جو مقدر میں ہے مل کر رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت عطا فرمائی ہے، جس پر میں شکر گزار ہوں۔
کامران : علم انسان کی اپنی ذات کو بھی فائدہ دیتا ہے۔ آپ جو بھی کاروبار یا تجارت کریں گے اسے اپنی تعلیم کی بدولت کامیاب بنالیں گے۔
ارسلان : بہت شکریہ۔
کامران : ٹھیک ہے پھر ملیں گے۔ اب اجازت دیں۔ اللہ حافظ
(کامران، ارسلان سے مصافحہ کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔)

45 دو مسافروں کے درمیان اخلاقی پستی انحطاط کے عنوان پر مکالمہ

(بس اسٹاپ پر بس رکتی ہے، سیٹ نمبر 15 پر ایک بڑے میاں بیٹھے ہیں۔ ایک نوجوان ان کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتا ہے اور گفتگو شروع ہوتی ہے۔)
نوجوان : السلام علیکم!
بزرگ : وعلیکم السلام! کیا نام ہے آپ کا بیٹا؟
نوجوان : جی میرا نام شعیب ہے اور میں ملتان جا رہا ہوں۔ آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟
بزرگ : جیتے رہو بیٹا، میں بہاول پور جا رہا ہوں۔
نوجوان : (سامنے والی سیٹ پر ایک آدمی سگریٹ سلگاتا ہے۔) ہیلو! بھائی صاحب! کچھ دیر رک جائیں۔ سگریٹ کے دھوئیں سے میرا دم گھٹتا ہے۔
سگریٹ نوش : کیوں جناب! میری مرضی ہے میں تو سگریٹ پیوں گا۔ آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو اٹھ جائیں۔
بزرگ : لاحول ولاقوۃ! اخلاقیات کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔
نوجوان : آپ دیکھیں! کتنے اچھے انداز میں درخواست کی تھی لیکن آگے سے کتنی بدخلقی سے جواب ملا۔
بزرگ : آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ کسی سے خلوص سے بات کرو تو آگے سے کہنے کو دوڑتا ہے۔
نوجوان : آپ ذرا ان کنڈکٹر صاحب کا رویہ ملاحظہ فرمائیں، کتنی بدتمیزی سے سواریوں سے مخاطب ہو رہا ہے۔
بزرگ : حدیث پاک میں حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے کہ: **"سب سے زیادہ کامل ایمان والا وہ ہے جو ان میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہو"** (ترمذی) دوسری جگہ ارشادِ مبارک ہے کہ **"کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"**۔ (صحیح بخاری)
نوجوان : آپ کی بات درست ہے لیکن ان کو کون سمجھائے۔ بات صرف یہاں تک محدود نہیں بلکہ اخلاقی اقدار اس حد تک پامال ہو چکی ہیں کہ اولاد، والدین کا کہا نہیں مانتی، شاگرد استاد کا احترام نہیں کرتے۔ کس کس بات کا رونا روئیں۔
بزرگ : قدیم دور اور موجودہ دور کی نوجوان نسل کے مزاج اور رویوں میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے دور میں رشتوں کا تقدس تھا۔ چھوٹے بڑوں کا احترام کرتے تھے مگر موجودہ دور ایسی خوبیوں سے محروم ہے۔
نوجوان : اب تو اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ دورانِ سفر کوئی سفید ریش بزرگ کھڑا ہوا ہو تو سیٹ دینے کے لیے کوئی نوجوان تیار نہیں ہوتا۔ محبت و احترام کے جذبات تو گویا مفقود ہو چکے ہیں۔
بزرگ : اچھے لوگ بھی ہیں بیٹا! جیسا کہ تمھاری قابلیت، سمجھ داری اور ادب دیکھ کر دل خوش ہوا ہے۔
نوجوان : یہ تو آپ کی شفقت ہے کہ مجھے آپ اچھا کہہ رہے ہیں ورنہ میں کس لائق ہوں۔ دراصل میں معاشرے کے اندر پھیلی اخلاقی پستی کے بارے میں عمومی بات کر رہا ہوں۔
بزرگ : بیٹا: حقیقت یہ ہے کہ **"باادب بانصیب اور بے ادب بے نصیب"** اس سے کم لفظوں میں حسن اخلاق کے بارے میں اور کیا تشریح ہو سکتی ہے۔
نوجوان : غضب تو یہ ہے کہ استاد جیسی عظیم ہستی سے بھی ادنیٰ رویہ برتا جاتا ہے۔ اساتذہ کرام کی ناقدری عام ہو چکی ہے۔ ذرا سی بات پر طلبہ بپھر جاتے ہیں۔ طلبہ میں اساتذہ کرام کا احترام ختم ہو چکا ہے۔

بزرگ : استاد کی بے ادبی کرنے والے طلبہ کو اکثر دھکے کھاتے ہی دیکھا ہے۔ اسی طرح والدین کے بھی حقوق ہیں جن کی بجا آوری ضروری ہے۔ آج کے دور میں اولاد بھی والدین سے باغی ہو رہی ہے۔
نوجوان : جی ہاں! یہ بھی بہت افسوس ناک پہلو ہے۔
بزرگ : اس میں بعض اوقات کچھ والدین کی غفلت بھی شامل ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت سے غفلت کرتے ہیں اور جب بچے بڑے ہو کر بے ادبی سے بات کرتے ہیں تو پھر پچھتاتے ہیں۔
نوجوان : آپ کی باتوں سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل رہا ہے۔
بزرگ : اور مجھے بھی فخر ہے کہ ایسے نوجوان اب بھی موجود ہیں جو بڑوں کی بات توجہ سے سنتے ہیں۔ دراصل ہمارا دین ہمیں خیر خواہی اور ادب کی ترغیب دیتا ہے۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ "الدین النصیحۃ" یعنی دین تو سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔
نوجوان : بالکل بجا فرمایا آپ نے اور ہماری اخلاقی پستی کی وجہ اسلامی تعلیمات سے روگردانی ہے۔ (اتنے میں بس میں کنڈیکٹر اور ایک مسافر کا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے بدکلامی سے پیش آتے ہیں۔)
نوجوان : سنتے رہیے، کیسے کیسے جملے استعمال ہو رہے ہیں، کہاں گیا بھائی چارہ اور احترامِ مسلم، نہ بڑوں کا ادب ہے نہ چھوٹوں پر شفقت ہے۔
بزرگ : یہی تو المیہ ہے ورنہ دین تو سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔ یہ تو بس کے سفر کا تجربہ ہو رہا ہے۔ آپ ذرا بازار میں گھوم پھر کر دیکھ لیں۔ بدیانتی عام ہے۔
نوجوان : بازار سے خوب یاد دلایا ہے آپ نے، کل ہی میں دو کلو سیب لے کر گھر گیا اور چیک کیا تو سارے گلے سڑے نکلے۔ جب ریڑھی والے کے پاس گیا تو اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔
بزرگ : یہ تو سراسر فریب اور دھوکہ بازی ہے اور ایسے شخص سے آپ ﷺ نے لاتعلقی کا اظہار فرمایا ہے۔
نوجوان : بس جناب! اللہ تعالیٰ ہی ہمارے حال پر رحم فرمائے۔
بزرگ : (آمین) اس پُرفتن اور نفسانفسی کے دور میں رجوع الی اللہ اور آپ ﷺ کی تعلیمات سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔
نوجوان : جی ہاں! اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت، کامیابی اور زندگی گزارنے کے اصول قرآن پاک میں ارشاد فرما دیے ہیں اور آپ ﷺ کی مبارک زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔
بزرگ : اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ سے بات کر کے دل خوش ہوا۔ اب اجازت کیوں کہ میرا اسٹاپ قریب آ چکا ہے۔
نوجوان : آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ حافظ
(بس رکتی ہے، بزرگ اور نوجوان مصافحہ کرتے ہیں اور بزرگ اپنا سامان اٹھا کر نیچے اتر جاتے ہیں۔)

46 دو دوستوں / طالب علموں کے درمیان ملک میں امن و امان کی خراب صورت حال پر مکالمہ

(اعجاز اور سجاد دونوں ہم جماعت ہیں اور ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد سجاد، اعجاز کے پاس آتا ہے اور دونوں میں گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔)
سجاد: السلام علیکم!
اعجاز: وعلیکم السلام، آیئے جناب، کیسے ہیں؟
سجاد: میں تو بالکل ٹھیک ہوں، لیکن آپ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آ رہے ہیں
اعجاز: کیا آپ موجودہ ملکی حالات سے باخبر ہیں؟
سجاد: جی ہاں! بالکل باخبر ہوں۔ آج کل ہمارے ملک میں امن و امان کی صورتِ حال بہت خراب ہے۔ ایک طرف فرقہ واریت اور دہشت گردی کے واقعات ہیں، جب کہ دوسری جانب کرپشن اور مہنگائی میں بے پناہ اضافہ۔
اعجاز: آپ خود فیصلہ کریں کہ پریشان کن حالات ہیں کہ نہیں؟
سجاد: ہاں بھئی، یہ تو حقیقت ہے، جب کہ ہمارا مذہب اسلام ہمیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان ایک دوسرے کو قتل کریں اور رشوت ستانی و بے ضابطگیوں کا بازار گرم کریں۔

اعجاز: یہی تو المیہ ہے کہ جس کی وجہ سے ہم ان گمبھیر مسائل سے دوچار ہیں۔ دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ ہر گروہ چاہے وہ سیاسی ہو یا مذہبی اپنے آپ کو زیادہ معتبر سمجھتا ہے۔

سجاد: آپ سچ کہتے ہیں کہ آج زندگی کا ہر شعبہ مختلف اختلافات کا شکار ہے۔ ہمارا مذہب امن و امان کا درس دیتا ہے۔ جب کہ ہم فرقوں میں بٹ کر نفرتوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ سیاسی طور پر ہم کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ معاشرہ ادب و آداب سے عاری ہے اور مادہ پرستی کا شکار ہے۔ ہمیں اپنے ملک سے زیادہ اپنی فکر ہے۔

اعجاز: دراصل ہمارے معاشرے کو جو بنیادی خرابی گھن کی طرح چاٹ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہم سب دوسروں پر تنقید کرتے ہیں، جب کہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

ہم نے ہر رُخ کے مقابل آئینہ رکھا مگر ایک خود کو آئینے کی آنکھ سے دیکھا نہیں

سجاد: جی ہاں! آپ نے بجا فرمایا۔ دہشت گردی بھی ہمارے ملک میں امن و امان کے خراب ہونے کی بڑی وجہ ہے۔

اعجاز: دراصل ہمارے دشمن ممالک ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ہم ترقی کریں، اس لیے کبھی تو وہ دہشت گردوں کی پشت پناہی کرتے ہیں اور کبھی اپنے ممالک سے پاکستان میں حالات خراب کرنے کے لیے جاسوس بھیجتے ہیں۔

سجاد: ملکی حالات کو خراب کرنے میں آئے دن ڈاکہ زنی اور چوری کے واقعات بھی تو ہیں۔ روزانہ اخبارات میں درجنوں ڈکیتی کی وارداتوں کا ذکر ہوتا ہے۔

اعجاز: آج کل ہمارے ملک میں امن و امان کو مزید خراب کرنے کے لیے اغوا برائے تاوان کا بازار گرم ہے۔ چند شر پسند عناصر اور بیرونی مفاد پرست لوگوں کے بچوں کو اغوا کر کے منھ مانگی رقم وصول کرتے ہیں یا اپنے ناجائز مطالبات منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سجاد: ہمارے ملک میں رشوت ستانی بھی بہت عام ہو چکی ہے، جس نے ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ کسی محکمے میں بھی چلے جائیں، رشوت کے بغیر کام نہیں ہوتا، حالاں کہ حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان مبارک ہے کہ:

"رشوت لینے والا اور دینے والا (دونوں) جہنمی ہیں۔" (طبرانی)

اعجاز: حالاں کہ اسلام ایک انقلابی تحریک ہے اور ایک مسلمان معاشرے کی برائیوں کے خلاف ہر لحظہ جہاد کرنے والا عامل ہے لیکن آج ہمارے پاس گفتار کا حُسن تو ہے، مگر کردار کی خوبی نہیں ہے۔

سجاد: جی ہاں! ہم نے زوال پذیر قوموں کی سبھی خرابیاں قبول کر لی ہیں۔ ہم نے اپنے ماضی کو فراموش کر دیا ہے۔

اعجاز: علامہ اقبالؒ نے بجا فرمایا تھا کہ:

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی کہ تُو گفتار وہ کردار، تُو ثابت وہ سیارا

سجاد: آپ کے خیال میں اس کا کیا حل ہے؟

اعجاز: ہمیں چاہیے کہ ان تمام مسائل کا حل قرآن و حدیث سے تلاش کریں، کیوں کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں تمام اصول واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں۔

سجاد: موجودہ حالات کو دیکھ کر تو یہی کہا جا سکتا ہے، بقول اقبالؒ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اعجاز: یہ تو حقیقت ہے کہ ہماری پستی اور زوال کی اصل وجہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے انحراف ہے۔

سجاد: آپ نے بجا فرمایا۔ ہم قرآن و حدیث پر عمل کر کے ہی ان سنجیدہ مسائل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

اعجاز: آپ کی بات بالکل درست ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سب اتفاق و اتحاد سے رہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے اللہ! ہمیں ہر قسم کے فتنہ و فساد سے بچا اور ہمارے ملک کو امن کا گہوارا بنا۔

سجاد: آمین

اعجاز: ثم آمین

سجاد: اعجاز بھائی! آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے بہت مفید باتیں بتائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ مجھے اجازت دیں۔ گھر پر امی جان انتظار کر رہی ہوں گی۔

(سجاد، اعجاز سے اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

47 دو دوستوں کے درمیان ہم نصابی سرگرمیوں کے موضوع پر مکالمہ

(فیصل آباد 2019)

(حکومت پنجاب کی طرف سے طلبہ و طالبات کے لیے ہم نصابی سرگرمیوں، تقریری اور تحریری مقابلوں کا اشتہار اخبار کی زینت بنا ہوا ہے۔ فہد سالِ اول کا طالب علم ہے، لائبریری میں بیٹھا اشتہار پڑھ رہا ہے۔ اس کا دوست عمران بھی آ جاتا ہے جو کہ ایم۔اے اُردو سالِ دوم کا طالب علم ہے۔ دونوں کے درمیان گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔)

عمران: ہاں بھئی فہد! اس قدر مگن دکھائی دے رہے ہو، آخر کیا نظر آ گیا اخبار میں؟

فہد: وہی تقریری اور تحریری مقابلوں کا اشتہار۔ بس اُسی کو دیکھ رہا ہوں۔

عمران: تو کیا اس مرتبہ پھر سے میدان میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

فہد: جی ہاں جناب! ہم میدان خالی چھوڑنے والے کب ہیں؟ آخر آپ کے دوست ہی تو ہیں۔

عمران: بہت خوب! زندگی نام ہی برسرِ پیکار ہونے کا ہے۔ مقابلے میں آمنے سامنے آنے کا۔

فہد: نصابی سرگرمیاں ہماری شخصیت کو نکھارنے میں کیا کردار ادا کرتی ہیں؟

عمران: نصابی سرگرمیاں انسانی شخصیت کو نکھارنے میں کئی طرح سے کردار ادا کرتی ہیں، تقریر انسان کو بولنے کے آداب سے آگاہ کرتی ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ الفاظ کے چناؤ کا ہنر سکھاتی ہے۔ موقع محل کے مطابق زبان کے استعمال کا طریقہ سکھاتی ہے۔

فہد: تحریری سرگرمیاں ہماری شخصی تعمیر کے سلسلہ میں کیا کردار ادا کرتی ہیں؟

عمران: کوئی بھی مصنف بچپن ہی سے مصنف نہیں ہوتا۔ کوئی بھی شاعر شروع دن سے باکمال شاعر نہیں ہوتا۔ صرف لکھنے کا شوق ہی اسے معراج بخشتا ہے۔ لکھنا ایک مکمل مہارت ہے۔ اس میں انسان کو بڑی مدت کے بعد کامیابی ہاتھ آتی ہے۔ ہاں کچھ لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو عمر ضائع کر دیتے ہیں لیکن تحریر ان کا تعارف نہیں بن پاتی۔

فہد: ملی نغمے اور قومی ترانے اس سلسلے میں کہاں تک معاون ثابت ہوتے ہیں؟

عمران: گنگنانا اور ملی ترانے پڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جس طرح شاعری کرنا جان جوکھوں کا کام ہے، بالکل اسی طرح ملی ترانے ترنم کے ساتھ پڑھنا بھی ایک مشقت طلب کام ہے۔ ہاں شوق کے آگے ہر چیز ہیچ و حقیر ثابت ہوتی ہے، جو بچے ملی نغموں اور ملی ترانوں کو ترنم کے ساتھ پڑھنے کے مقابلہ جات میں حصہ لیتے ہیں، تو اس سے اُن کے اندر کا ہنر نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

فہد: اسٹیج پر آ کر کسی کردار کا روپ دھار کر پرفارمنس انسان کو کس قدر با اعتماد بناتی ہے۔؟

عمران: اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار صلاحیتیں عطا کر کے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ انسان کے اس دنیا میں کئی روپ ہوتے ہیں، کچھ لوگ مختلف شخصیات کا روپ دھار کر جب اسٹیج پر آتے ہیں تو ان کی کارکردگی قابلِ تحسین اور قابلِ دید ہوتی ہے۔

فہد: ان تمام سرگرمیوں کا عملی مظاہرہ کرنے سے انسان کو کیا حاصل ہوتا ہے؟

عمران: انسان کے لیے ایک قیمتی دولت خود اعتمادی ہوتی ہے۔ ان سرگرمیوں کی بدولت اُسے یہ دولت نصیب ہوتی ہے۔ اُسے تقریر کے ذریعے قوتِ شعور مل جاتی ہے۔ تحریر کے ذریعے اُس کو قوتِ تشہیر مل جاتی ہے۔

فہد: آج کل نصاب کی کتابوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے، اِن حالات میں طلبہ ہم نصابی سرگرمیوں میں شرکت سے بھاگتے ہیں۔ اس کا علاج کیا ہے۔؟

عمران: آج کے زمانے کو ہم "مقابلے" کا زمانہ کہتے ہیں۔ استاد اور طالب علم دونوں اس چکی میں بُری طرح پسے ہوئے ہیں، دونوں ہی اس کام کو "بوجھ" تصور کرتے ہیں۔ لیکن "اہلِ شوق" کے لیے سب ممکن ہے۔ کیوں کہ:

ع اہلِ دل تو اندھیروں میں اُجالا کرتے ہیں

فہد: ہم نصابی سرگرمیوں کو طلبا میں مقبول بنانے میں حکومت کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

عمران : ہم نصابی سرگرمیوں کو طلبا میں مقبول بنانے میں حکومت درج ذیل کردار ادا کرسکتی ہے:

☆ طلبا کو ان مقابلوں میں شرکت کا لازمی پابند بنایا جائے۔

☆ طلبہ کے لیے پُرکشش انعامات کا سلسلہ مزید بڑھایا جائے۔

☆ طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی حوصلہ افزائی کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

فہد : تقریر ایک فن ہے، اس فن میں نمایاں کارکردگی دکھانے والوں کے لیے کیا خصوصی اقدامات ہونے چاہییں؟

عمران : اس میں کوئی شک نہیں کہ تقریر ایک مشکل فن ہے جو طلبہ اس میدان میں اعلیٰ کارکردگی دکھاتے ہیں، انھیں مختلف میڈیا چینلز پر بلایا جائے اور وہاں پر انھیں تقاریر کا موقع دیا جائے۔ اِس طرح یہ طلبہ مقبولیت پانے کے شوق میں بھی اس فن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

فہد : تحریری مقابلوں میں جیتنے والے طلبہ کو کس انداز میں خراج تحسین پیش کیا جا سکتا ہے؟

عمران : تحریری مقابلوں میں اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کے مضامین ملک کے معروف اخبارات اور رسائل میں شائع کیے جائیں۔ اِس طرح سے طلبہ کے اندر تحریر کا شوق مزید پختگی اختیار کرے گا۔ اس سے ان کی پوشیدہ صلاحیتیں اُجاگر ہوں گی اور وہ اس جملے کی زندہ تصویر بن جائیں گے کہ:

حوصلہ نہ ہارو آگے بڑھو، منزل اَب کے دور نہیں

فہد : نصابی سرگرمیوں میں شرکت طلبہ کے تعلیمی معاملات میں کس حد تک مدد کرسکتی ہے؟

عمران : نصابی سرگرمیوں میں شرکت سے طلبہ کی ذہنی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں اعتماد محسوس کرنے لگتے ہیں، اُن میں خود سے لکھنے کا جذبہ بیدار رہتا ہے۔ اُن کی شخصیت میں کشش جھلکنے لگتی ہے۔ وہ ہر کسی کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔

فہد : نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے ہم کن ذرائع سے مدد لے سکتے ہیں؟

عمران : نصابی سرگرمیوں میں شرکت کے لیے بہترین ذرائع آپ کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ وہ آپ کے بہترین رہنما ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ بھی اِن سرگرمیوں کی تیاری کے لیے اچھا ذریعہ ہے۔ اخبارات اور رسائل سے بھی اس سلسلے میں مدد لی جا سکتی ہے۔

فہد : آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے نہ صرف میری رہنمائی فرمائی بلکہ مفید مشوروں کے انبار بھی لگا دیے، جو میرے لیے نہایت مفید ہوں گے۔ ان شاء اللہ میں آپ کی نگرانی میں بھرپور تیاری کر کے اس سال بھی مضمون نویسی کے مقابلوں میں حصہ لوں گا اور اپنی سابقہ ''اوّل پوزیشن'' کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔

عمران : کوئی بات نہیں یہ تو میرا فرض ہے۔ آپ ہمارے کالج کے ہونہار طالب علم ہیں، آپ نے ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے دلی ارادوں کو کامرانی اور شادمانی عطا کرے۔

(تفریح کا دورانیہ ختم ہونے کے بعد گھنٹی دوبارہ بجتی ہے اور پیریڈ کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ عمران ایم۔اے بلاک کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور فہد اپنی کلاس کی جانب چلا جاتا ہے۔)

48 دو دوستوں کے درمیان جمہوریت کے موضوع پر مکالمہ

(بہاول پور بورڈ 17ء)

(ملک بھر میں الیکشن کی مہم جاری ہے۔ دو دوست عبدالرحمٰن اور عزیر سٹی پارک میں ایک بنچ پر بیٹھے ہُوئے ہیں۔ ایسے میں اُن کے سامنے سے ایک سیاسی پارٹی کا جلوس جمہوریت زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے گزرتا ہے۔ عبدالرحمٰن اپنے دوست عزیر سے یوں ہم کلام ہوتا ہے۔)

عبدالرحمٰن : عزیر بھائی! آپ کے خیال میں جمہوری نظام بہتر ہے یا فوجی نظام؟

عزیر : میرے خیال میں تو جمہوری نظام ہی بہترین ہے۔

عبدالرحمٰن : آپ اس قدر یقین سے کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت ہی بہترین نظامِ حکومت ہے۔

عزیر : جمہوریت کا اسلام کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔

عبدالرحمٰن : اگر ایسی بات ہوتی تو شاعرِ مشرق جمہوریت سے اس قدر نالاں نہ ہوتے۔ آپ نے اُن کا مشہورِ زمانہ شعر سنا نہیں شاید۔

عزیر : ایسا کیا کہہ دیا حضرت اقبالؒ نے ذرا مجھے بھی تو بتاؤ، کیا فرما گئے شاعرِ مشرقؒ۔

عبدالرحمٰن : اُن کا مشہورِ زمانہ شعر ہے کہ:

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

عزیر : اس میں کیا خرابی ہے؟ اقبالؒ تو ہمیں کہہ رہے ہیں کہ جمہوری نظام میں جو خرابی ہے، اگر اس کو دور کر دیا جائے تو یہ طرزِ حکومت بہتر ہو جائے گا، کیوں کہ شاعرِ مشرق دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں سمجھتے تھے۔ کیا آپ ان کے اس خیال سے واقف ہیں؟

عبدالرحمٰن : نہیں بھائی! مجھے تو معلوم نہیں، اقبالؒ نے کیا فرمایا ہے، اس کے بارے میں تھوڑی سے وضاحت ہی کر دیں۔

عزیر : علامہ اقبالؒ نے ہماری دینی اور سیاسی رہنمائی کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے کہ:

ع جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

عبدالرحمٰن : جمہوری نظام میں اپنے نمائندے منتخب کرتے ہوئے کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟

عزیر : کسی بھی امیدوار کا انتخاب کرتے وقت ہمیں اُس کی ذاتی شخصیت کو مدِنظر رکھنا چاہیے نہ کہ اُس کی پارٹی کو، کیوں کہ ہر پارٹی میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے امیدوار ہوتے ہیں۔

عبدالرحمٰن : ہاں بھئی! آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔ اگر ہم پڑھے لکھے لوگوں کا انتخاب کریں گے تو وہ یقیناً ہمارے بارے میں بہتر ہی سوچیں گے۔

عزیر : جی ہاں! بالکل ایسا ہی ہے، تعلیم یافتہ سیاست دان ہی اَپنے عوام کی خدمت بہتر انداز میں کرسکتے ہیں۔

عبدالرحمٰن : جمہوری نظام حکومت تمھارے خیال میں ہمارے لیے کیوں کر فعال کردار ادا کرتا ہے؟

عزیر : جمہوریت میں ہمیں ''اظہارِ رائے'' کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے، مفید رائے دہندگی کے ذریعے آپ اپنا فیصلہ دے سکتے ہیں اور اپنے پسندیدہ امیدوار کو کامیاب کرا سکتے ہیں۔

عبدالرحمٰن : جمہوری نمائندے اپنے عوام کی خدمت کس طرح سے بہتر انداز میں کرسکتے ہیں؟

عزیر : ہمارے منتخب کردہ نمائندے جب ایوانِ اقتدار میں جاتے ہیں تو اسمبلی میں اپنے علاقے کے مسائل پیش کرتے ہیں اور اُن مسائل کو حل کرنے کے لیے فنڈز حاصل کرسکتے ہیں اور اپنے علاقے میں فلاح و بہبود کے منصوبے شروع کرسکتے ہیں۔

عبدالرحمٰن : جمہوری نظام میں ادارے کیوں استحکام محسوس کرتے ہیں؟

عزیر : جمہوری نظام میں تمام ادارے مکمل آزادی کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہتے ہیں اور فعال طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ تمام محکموں اور اداروں کو حکومت کی طرف سے ترقیاتی فنڈز وقتِ مقررہ پر موصول ہوتے رہتے ہیں، جس سے ادارے مزید فعال ہو جاتے ہیں۔

عبدالرحمٰن : جمہوری نظام میں ایوانِ بالا (سینٹ) اور ایوانِ زیریں (قومی اسمبلی) کو کیا اہمیت حاصل ہے؟

عزیر : جمہوری نظام میں اِن دونوں ایوانوں کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ کوئی بھی نیا بل پہلے قومی اسمبلی میں بحث کے لیے پیش کیا جاتا ہے، پھر اس کو منظوری کے لیے سینٹ کے اراکین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

عبدالرحمٰن : جمہوری نظام کو مستحکم کرنے کے لیے آپ اور آپ کے گھر والے کیا کردار ادا کرسکتے ہیں؟

عزیر : میرے والد صاحب بڑے جمہوریت پسند ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں ہمیں کبھی پابند نہیں کیا کہ فلاں امیدوار کو ووٹ دیں۔ وہ کہتے ہیں ووٹ قومی امانت ہے۔ یہ اس شخص کو دیں جو ملک و قوم کی بہتری کے لیے، بہتر کردار ادا کرسکتا ہے۔

عبدالرحمٰن : آپ کے والد صاحب کی سوچ بڑی مثبت ہے۔ اگر ہمارے معاشرے میں ہر والد کی یہی سوچ ہو جائے اور وہ اسی نہج پر اپنے بچوں کی تربیت کرے تو ملک میں انقلاب آسکتا ہے۔

عزیر : اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، چلو گھر چلتے ہیں۔

(دونوں دوست اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں)

49 منشیات کے نقصانات پر دو دوستوں کے درمیان مکالمہ

(اظہر اور حارث دونوں دوست ہیں۔ وہ ہر شام سیر کے لیے سٹی پارک میں جاتے ہیں۔ آج جب وہ سیر کے لیے جا رہے تھے تو انھوں نے دو افراد کو نہایت ہی خستہ حالت میں کوڑے کے ڈھیر پر نشہ کرتے ہوئے دیکھا۔ جنھیں دیکھ کر اُنھیں بے حد افسوس ہوا۔ وہ ان کے قریب سے گزر گئے اور پارک میں ایک بنچ پر بیٹھ کر آپس میں یوں ہم کلام ہوئے۔)

اظہر : یہ لوگ نشے کے عادی کیوں کر ہو جاتے ہیں؟

حارث : نشہ بھی موذی امراض کی طرح ایک مرض ہے، جو کسی کو کسی سے لگ جاتا ہے۔ مشہور ضرب المثل ہے۔

"تخمِ تاثیر صحبت کا اثر"

اظہر : ہاں! یار یہ بات تو ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ یہ لوگ بھی آخر کسی نہ کسی گھر کے چشم و چراغ ہوتے ہیں جو یوں کوڑے کے ڈھیروں پر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آخر ہمیں اِن کو اس اذیت سے بچانے کے لیے کیا اقدامات کرنا ہوں گے؟

حارث : کوئی بھی نشہ جب اپنی انتہائی حدود کو چھو لیتا ہے تو وہ ناقابل علاج ہو جاتا ہے۔ اِن لوگوں کو راہِ راست پر لانا بہت مشکل ہے۔

اظہر : مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن تو نہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں کے والدین سے ملنا چاہیے۔ آخر ملک میں جگہ جگہ نشے بچنے کی علاج گاہیں "خصوصی سنٹر" بن چکی ہیں، ان لوگوں کو علاج گاہوں میں داخل کرا دینا چاہیے۔

حارث : ہاں اظہر یہ حل تو ہے، لیکن پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس قدر خطرناک نشہ کے عادی کیسے بن جاتے ہیں؟

اظہر : ہر برائی کا کوئی نہ کوئی ابتدائی مرحلہ ضرور ہوتا ہے۔ ایسے لوگ شروع شروع میں فیشن کے طور پر سگریٹ کے کش لگانے کا شغل اختیار کرتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اس کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ آخر ایک وقت آتا ہے کہ وہ نشہ میں مبتلا افراد کے ہاتھوں شکار ہو کر نشے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حارث : کیا شروع میں ان کے والدین کو ان کی حالت کا علم نہیں ہوتا اور وہ اس سلسلہ میں کیا اقدامات اٹھاتے ہیں؟

اظہر : کچھ والدین ہوتے ہیں جن کو کسی نہ کسی ذریعے سے اپنے بچوں کی منفی سرگرمیوں کا پتا چل جاتا ہے۔ لیکن پوچھنے پر وہ والدین کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتے ہیں اور صاف مکر جاتے ہیں۔ یہ لوگ خفیہ طور پر نشہ کرتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ اس میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

حارث : معاشرہ مل جل کر رہنے کا نام ہے۔ اِن لوگوں کے سلسلے میں ہمارا بھی تو کوئی کردار ہوگا، تو ہم اس سلسلہ میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

اظہر : اس سلسلے میں ہمیں قرآن مجید کے فرمان کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنانا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"نیک کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور برائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو"

حارث : اس فرمان سے ہم نشہ کرنے والوں کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

اظہر : نشہ کے کرنے والے بھیک مانگنے کے بھی عادی ہو جاتے ہیں۔ ہمیں کسی ایسے شخص کو ہرگز ہرگز بھیک نہیں دینی چاہیے جو دیکھنے میں نشہ کرنے والا نظر آتا ہو۔

حارث : مگر یہ لوگ تو اور بھی ناجائز طریقے اختیار کر لیتے ہیں، چوری کرنا اُن کی عادت بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے گھر والوں سے لڑ جھگڑ کر پیسے بٹورنا بھی اِن کی عادت بن جاتی ہے۔ آخر اِس کا کیا علاج ہے؟

اظہر : اِس کا بھی علاج ہے۔ اگر یہ لوگ چوری کرتے پکڑے جائیں تو اِن کو جیل میں ڈال دیں اور اگر یہ اپنے گھر والوں کو تنگ کرتے ہوں تو پولیس والوں کو اطلاع دے کر ان کو گرفتار کروا دیں۔ جیل میں اِن کو مشقت والے کام کروائے جائیں اور کھانے میں معمولی کھانا دیا جائے، اس طرح سے اِن لوگوں کو نشہ سے روکا جا سکتا ہے۔

حارث : حکومت اِس سلسلہ میں کیا اقدامات کر سکتی ہے؟

اظہر : حکومت اس سلسلہ میں اُن لوگوں کو پکڑے جو منشیات وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے ہیں، کیوں کہ ایسے لوگ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ اِن کے ہاتھ بڑے بڑے سورماؤں کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ اِن کا سدِ باب صرف اور صرف حکومت کر سکتی ہے۔

حارث : مقامی سطح پر لوگ نشہ میں مبتلا افراد کی مدد کس طرح سے کر سکتے ہیں؟

اظہر : مقامی سطح پر لوگ نشہ کرنے والوں کی مدد اس طرح سے کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی نشہ کرنے والا پیسے مانگتا ہے کہ وہ بھوکا ہے تو لوگ اُسے کھانا کھلا دیں پیسے ہرگز نہ دیں۔

حارث : منشیات فروخت کرنے والوں کے ساتھ حکومت کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟

اظہر : ایسے لوگوں کے خلاف حکومت کو انتہائی قدم اٹھانے ہوں گے۔ اِن لوگوں کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کر کے فوری گرفتار کر لیں اور جیلوں میں ڈال دیں۔ اِن لوگوں کو نشانۂ عبرت بنانے کے لیے عبرت ناک سزائیں دی جائیں تاکہ اِن کو دیکھ کر لوگ عبرت پکڑ سکیں۔

حارث : منشیات فروش کس طرح سے ہمارے طلبہ و طالبات کو نقصان پہنچا رہے ہیں؟

اظہر : منشیات مافیہ کے کارکن بھیس بدل کر یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں جاتے ہیں اور ہمارے طلبہ میں یہ زہر تقسیم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یونی ورسٹیوں اور کالجوں کی انتظامیہ کو بھرپور اقدام اٹھانے ہوں گے تاکہ ہمارا قیمتی سرمایہ اس "لت" میں پڑنے سے بچ جائے۔

حارث : منشیات کا کاروبار کرنے والے اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟

اظہر : منشیات کا کاروبار کرنے والے افراد کے پاس دولت کی ریل پیل ہوتی ہے۔ وہ اپنے "کالے دھن" کو سفید کرنے کے لیے فلاحی کارکن کا روپ دھار لیتے ہیں اور اندر ہی اندر اپنا کالا دھندہ بھی پورے عروج پر جاری رکھتے ہیں۔

حارث : منشیات کے نقصانات سے آگاہی کے متعلق ہمارا اخباری میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

اظہر : منشیات کے نقصانات سے آگاہی کے متعلق ہمارے اخبارات خصوصی مضامین شائع کر کے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا پر چینلز منشیات کے نقصان سے متعلقہ ڈاکومنٹری اور مباحثی پروگرام ترتیب دے کر عوام کے اندر شعور پیدا کر سکتے ہیں۔

حارث : دراصل حکومت اور عوام مل کر ان خطرناک افراد کے خلاف عملی اقدامات اٹھائیں تو خاطر خواہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

(مغرب کی اذان کی آواز مسجد سے آنا شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں دوست نماز کے لیے مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں)

50 مالک اور ملازم کے درمیان تنخواہ میں اضافہ کے موضوع پر مکالمہ

(شہر کے معروف کتاب گھر "اسلام بک ڈپو" کے مالک اکرام صاحب کمپیوٹر پر کسی گاہک کے بل کا اندراج کرنے میں مصروف ہیں کہ اچانک اُن کا ملازم سعید خان آتا ہے اور یوں ہم کلام ہوتا ہے۔)

سعید : السلام علیکم! اکرام صاحب۔

اکرام صاحب : وعلیکم السلام! سعید کیا حال ہے؟ اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟

سعید : جی میں خیریت سے ہُوں۔ میں اکثر گھر پر ہی ہوتا ہُوں۔

اکرام صاحب : سعید بھئی: آپ مسلسل تین دنوں سے غائب ہیں۔ بھائی انیس نے کئی بار آپ کو فون بھی کیا، لیکن فون بند تھا۔ ارشد کو آپ کے گھر بھیجا تو آپ کے بھائی صاحب نے بتایا کہ سعید کہیں گیا ہُوا ہے۔

سعید : دراصل اکرام بھائی! میں آپ کو بتانے آیا تھا کہ میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔

اکرام صاحب : آپ ملازمت کو کیوں خیر باد کہنا چاہتے ہیں؟ کوئی وجہ بھی تو ہوگی، کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔

سعید : مجھے تنخواہ کم ملتی ہے، جس میں گزارا مشکل سے ہوتا ہے۔

اکرام صاحب : میرے خیال میں آپ کی تنخواہ تو کم نہیں ہے۔ اب آپ بارہ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ لے رہے ہیں اور اگلے ماہ 10% سالانہ اضافہ کے حساب سے بارہ سو روپے مزید اضافہ ہو جائے گا۔

سعید : دراصل اکرام بھائی! (شرماتے ہوئے) اگلے ماہ میری شادی ہو رہی ہے۔ موجودہ تنخواہ میں گزارا کرنا مشکل ہو جائے گا۔

اکرام صاحب : واہ بھئی! اچھی خبر سنائی ہے۔ مٹھائی ہی ساتھ لے آتے۔ چلو اس خوشی میں اگلے ماہ سے آپ کی تنخواہ میں دس کے بجائے بیس فی صد اضافہ کر دیتے ہیں۔

سعید : شکریہ اکرام بھائی! آپ نے تو کمال مہربانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ میرے دل سے تو آپ کے لیے بس دعائیں نکل رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو بے حساب نوازتا رہے۔

اکرام صاحب : آمین۔ اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میرا فرض ہے۔ حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اپنے ملازموں کے بارے میں فکر مند ہونے کا درس دیا ہے۔

سعید : یہ تو آپ کی غریب پروری اور شفقت ہے اور ہم جیسے غریبوں کے ساتھ آپ کا محبت بھرا رویہ قابلِ تحسین ہے۔

اکرام صاحب : آپ جیسے محنتی نوجوان ہی تو میرے دست و بازو ہیں، آپ کے ساتھ شفقت کیوں نہ کروں۔

سعید : یہ تو آپ کا حسنِ نظر اور حسنِ ظن ہے۔ مجھے اپنے رویے پر ندامت ہو رہی ہے۔ مجبور ہو کر آپ سے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کیا ہے۔ دراصل مہنگائی نے آج کل زندگی دشوار اور مشکل بنا دی ہے۔

اکرام صاحب : اس پریشانی میں ہر کوئی مبتلا ہے۔ کوئی شخص بھی مہنگائی کے عذاب سے محفوظ نہیں ہے۔

سعید : جی ہاں اکرام بھائی: بجا فرمایا آپ نے، مہنگائی کے علاوہ معاشرتی تفریق نے بھی ہمیں مختلف طبقوں میں بانٹ رکھا ہے۔

اکرام صاحب : واہ سعید میاں، آپ تو بڑے حساس اور ذمہ دار فرد بن گئے ہیں، میں نے پہلے کبھی آپ کو اس قدر حساس نہیں پایا۔

سعید : آپ کو تو معلوم ہے کہ میں فارغ اوقات میں کتابیں اور اخبار پڑھ لیتا ہوں اور حالاتِ حاضرہ سے واقف رہتا ہوں، اس لیے میں معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتا ہوں۔

اکرام صاحب : یہی تو فائدہ ہے کتابوں کی دکان پر کام کرنے کا، مطالعہ ہم کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ اور گھریلو پریشانیوں سے بچنے کے لیے ہمیں حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک فرمان مبارک کو زندگی میں نافذ کرنا ہوگا۔

سعید : اکرام بھائی! وہ کون سا فرمان مبارک ہے کہ جس میں ہمارے مسائل کا حل ہے؟

اکرام صاحب : حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے میانہ روی اختیار کی، وہ محتاج نہیں ہوگا''۔ (مسند احمد: 8935)

سعید : جی اکرام بھائی! اسی فرمان مبارک میں ہمارے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم زبانی طور پر اس کا اظہار کر دیتے ہیں لیکن اپنی زندگی میں اس کو نافذ نہیں کرتے۔

اکرام صاحب : حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا ہر فرمان مبارک قرآن پاک کی تعلیمات کی عملی تفسیر ہے۔ جب تک ہم اس پر عمل نہیں کریں گے۔ ہم پریشانیوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ تمام پریشانیوں کا حل آپ ﷺ کے نورانی اعمال کی اتباع کرنے میں ہے۔

سعید : مجھے اجازت دیجیے، میں ان شاء اللہ کل سے آپ کے پاس کام کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔ آپ کے اس تعاون پر میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

اکرام صاحب : اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں۔

سعید : آپ کی یہی زندہ دلی ہے کہ ہم ملازم ہو کر بھی دکان پر ایسے کام کرتے ہیں کہ جیسے ہمارا اپنا کام ہو۔

اکرام صاحب : اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے۔ آپ کو کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو تو مجھے یا عمران بھائی کو بتا دیا کریں۔

سعید : عمران بھائی تو پہلے بھی مجھ پر بہت شفقت کرتے ہیں، وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ اب میں چلتا ہوں، دیر ہو رہی ہے۔ امی جان انتظار کر رہی ہوں گی۔ اللہ حافظ!

اکرام صاحب : اللہ آپ کو بھی اپنی حفاظت میں رکھے۔

(سعید خان اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور اکرام صاحب دوبارہ کمپیوٹر پر حساب کتاب میں مصروف ہو جاتے ہیں۔)

51 دو دوستوں کے درمیان ''شجر کاری'' کے موضوع پر مکالمہ

(عثمان پارک میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہے اس کا دوست عمر آتا ہے اور ہم کلام ہوتا ہے۔)

عمر: السلام علیکم!

عثمان: وعلیکم السلام!

عمر: عثمان کیسے ہو؟

عثمان: میں ٹھیک ہوں۔

عمر: نہیں بھئی، تمھارے چہرے سے پریشانی اور اداسی عیاں ہے۔ بتاؤ آخر ماجرا کیا ہے؟

عثمان: (پسینہ پونچھتے ہوئے) بس یار کیا بتاؤں۔ کتنی شدید گرمی ہے۔ آج تو درجہ حرارت 48 سینٹی گریڈ محسوس ہو رہا ہے۔

عمر: ہاں یار! شکر کرو اس پارک میں درخت موجود ہیں، ورنہ یہاں ہمارا ٹھہرنا دشوار ہو جاتا۔

عثمان: تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن آج کل لوگوں کو معلوم نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے کہ وہ قدرت کی بہترین نعمت درختوں کی قدر نہیں کرتے اور انھیں بے رحمی سے کاٹ رہے ہیں۔

عمر: تمھیں وہ منظر یاد ہیں، جب سڑکوں کے دونوں اطراف شیشم، بہڑس، پیپل وغیرہ کے درخت ہوتے تھے اور ان درختوں پر چہچہاتے پرندے کیسا خوب صورت منظر پیش کرتے تھے۔

عثمان: افسوس کہ آج یہ درخت ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

عمر: ہاں یار! جب میں بچپن میں گاؤں جایا کرتا تھا تو وہاں سرسبز و شاداب درخت، جہاں ماحول کو راحت بخشتے تھے وہاں یہ ہمیں گرمی سے بھی محفوظ رکھتے تھے۔

وجد میں ڈالیوں پر، بلبلِ شیدا کی چہک — آنکھیں ہوتی ہیں تنک دیکھ کے سبزے کی لہک
دل یہ کہتا ہے عجب منظر لاثانی ہے — صحن گلشن میں بچھا مخمل کاشانی ہے

عثمان: واہ! واہ! بہت خوب۔ لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ لوگ درخت کیوں کاٹتے ہیں؟

عمر: دراصل یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنے کے عادی ہوتے ہیں اور چند روپوں کی خاطر درختوں کو بے دردی سے کاٹ دیتے ہیں۔

عثمان: لیکن ہمارا مذہب اسلام تو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

عمر: جی ہاں! ہمارے پیارے حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی بلا ضرورت ایک شاخ بھی توڑنے سے منع فرمایا ہے۔

عثمان: تمھیں معلوم ہے کہ درخت کم ہونے کی وجہ سے آج ہمارے ملک میں آلودگی کتنی شدت سے پھیل رہی ہے۔ آج فضائی آلودگی کی وجہ سے سانس لینا بھی دشوار ہوتا جا رہا ہے۔

عمر: درخت ختم ہونے کی بدولت انسانوں کی صحت پر مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

حیران ہیں طبیبانِ عصر یہ کرشمہ دیکھ کر — گیسیں ملیں، سیسہ ملا میرے گردوں کا معائنہ جب کیا

عثمان: یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔

عمر: جی ہاں! درحقیقت ایک درخت بہت سے لوگوں کو آکسیجن مہیا کرتا ہے اور یہ درخت ہی تو ہیں جو آکسیجن کے ساتھ ساتھ بارش کا سبب بھی بنتے ہیں۔

عثمان: کیا ہماری حکومت اس سلسلے میں کچھ کام کر رہی ہے؟

عمر: ہماری حکومت شجر کاری کے سلسلہ میں جو اقدامات کر رہی ہے وہ ناکافی ہیں۔

عثمان: ہماری حکومت کو اس سلسلہ میں اور کیا کرنا چاہیے؟

عمر: حکومت کو چاہیے کہ شجر کاری کی مہم کو وسیع بنیادوں پر شروع کرے اور لوگوں میں درختوں کی اہمیت و افادیت سے آگاہی کے لیے مختلف پروگراموں کا اہتمام کرے۔

عثمان: اس سے کیا فائدہ ہوگا؟

عمر: حکومت کے ان اقدامات سے عوام میں درخت لگانے کا شعور اور شوق پیدا ہوگا۔ جب ہمارے ملک میں درخت زیادہ ہوں گے تو صحت مند معاشرہ تعمیر ہوگا۔

عثمان: ہمارے ملک میں جنگلات کتنے فیصد رقبے پر ہونے چاہییں؟

عمر: ہمارے ملک کے صرف 5 فیصد رقبے پر جنگلات ہیں، جب کہ یہ کم از کم 25 فیصد رقبے پر ہونے چاہییں۔ جس سے نہ صرف درجہ حرارت میں واضح کمی آئے گی بلکہ ماحولیاتی آلودگی میں بھی کمی واقع ہوگی۔

عثمان: تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن ہمیں بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔

عمر: جی بالکل! ہمیں بھی اپنی مدد آپ کے تحت درخت لگانے چاہییں، کیوں کہ یہ بھی صدقہ جاریہ ہے۔

عثمان: شکریہ عمر! آپ نے بہت مفید باتیں بتائیں اور مناسب رائے دی۔ ان شاء اللہ میں بھی اس دفعہ شجرکاری مہم میں بھرپور حصہ لوں گا۔

عمر: اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

عثمان: شکریہ عمر بھائی۔

عمر: اچھا عثمان بھائی! کافی دیر ہوگئی ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔

(دونوں دوست اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔)

52 دو سہیلیوں کے مابین ''جہیز ایک لعنت ہے'' کے عنوان پر مکالمہ

(راولپنڈی بورڈ 2012ء، لاہور بورڈ، 17 ملتان 2017) (لاہور بورڈ 2023)

(عالیہ اور عشرت دونوں سہیلیاں ہیں۔ اتوار کے دن کالج سے چھٹی ہے۔ عالیہ اپنی سہیلی کے گھر جاتی ہے اور اس سے یوں ہم کلام ہوتی ہے۔)

عالیہ: السلام علیکم!

عشرت: وعلیکم السلام!

عالیہ: بڑی مصروف دکھائی دیتی ہو، آج تو چھٹی کا دن ہے اور خالہ جان بھی دکھائی نہیں دے رہیں۔ خیریت تو ہے؟

عشرت: ہاں بھئی! امی جان آج ہماری ہمسائیگی میں جو خالہ آسیہ رہتی ہیں، ان کے ہاں گئی ہیں۔

عالیہ: خیریت تو ہے، وہ صبح سویرے ہی ان کے ہاں چلی گئی ہیں؟

عشرت: جی ہاں! خالہ آسیہ کی چھوٹی بیٹی جمیلہ کی شادی جو پچھلے ہفتے ہوئی تھی۔

عالیہ: (بات کاٹتے ہوئے) ہاں ہاں! تو کیا ہوا اُسے؟

عشرت: بھئی! اس کے شوہر نے اُسے طلاق دے دی ہے، جس کی وجہ سے اُن کے گھر میں قیامت کا سا سماں ہے۔

عالیہ: طلاق! وہ کیسے اور کیوں؟ ابھی تو شادی کو صرف ایک ہفتہ ہی ہوا ہے۔

عشرت: وہی پرانی کہانی کہ بہو! جہیز میں کیا لائی ہو؟

عالیہ: پتا نہیں ہمارے معاشرے کو کیا ہو گیا ہے؟ گویا ہم صرف نام کے مسلمان بن کر رہ گئے ہیں۔ شاید حضرت اقبالؒ نے ہمارے بارے میں بجا فرمایا تھا:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

عشرت: جی ہاں! آج صورتِ حال یقیناً ایسی ہی ہو چکی ہے، ہمارے نام تو مسلمانوں والے ہیں، لیکن ہماری شکل و صورت انگریزوں جیسی اور رہن سہن ہندوؤں کے مشابہ ہو چکا ہے۔

عالیہ: دراصل جہیز ہمارے معاشرے میں ایک ناسور کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ امیر والدین اپنی بیٹیوں کو جہیز کی مد میں کثیر سامان سے نوازتے ہیں۔ جن کی دیکھا دیکھی غریب اور متوسط طبقہ بھی اس چکی میں پسنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالاں کہ دینِ اسلام جہیز کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔

عشرت: ہمارے سامنے حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی عملی سیرت بہترین نمونے کی صورت میں موجود ہے۔ دینِ اسلام ہمیں بیٹیوں کو خالی ہاتھ گھر سے رخصت کرنے کو نہیں کہتا بلکہ اس کی جائز ضروریات زندگی دے کر رخصت کرنے کا شرعی حکم ہے۔

عالیہ: جی بالکل درست کہا آپ نے۔ حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کو ایک مشکیزہ، ایک چارپائی، جانماز اور ایک چکی دے کر رخصت فرمایا تھا۔

عشرت: جہیز بیٹی کا حق ہے لیکن رحمت سے زحمت کس صورت میں بن جاتا ہے؟

عالیہ: جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جب تک نکاح کی سنت نباہتے رہے، تب تک وہ جہیز کی نحوست کا شکار نہ ہوئے تھے۔ دراصل طویل عرصہ تک ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے رہنے کی وجہ سے ان کی یہ بُری رسم مسلمانوں میں بھی رواج پا گئی۔

عشرت: جی ہاں! کچھ ایسی ہی حقیقت کو شاعرِ مشرق نے قلم بند کیا ہے کہ:

حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ امت روایات میں کھو گئی

عالیہ: حقیقت یہ ہے کہ آج ہم نے اسراف اور فضول خرچی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ اُمرا شادی بیاہ کے موقعوں پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں اور بیٹیوں کو جہیز میں قیمتی سامان سے نوازتے ہیں۔ جسے دیکھ کر غریب گھرانوں کی لڑکیاں احساسِ کمتری اور مایوسی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

عشرت: جہیز جیسی لعنت کے سدِ باب کے لیے ہماری حکومت کیا اقدامات کر سکتی ہے؟

عالیہ: اگر حکومت چاہے تو ہر برائی کا قلع قمع کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ قومی اسمبلی میں متفقہ طور پر ایک بل پاس کرے، جس میں اس بات کا تعین کر دیا جائے کہ جہیز کی مد میں صرف چند ضروری اشیا دی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا تو اسے کڑی سزا دی جائے گی۔

عشرت: جہیز کے خاتمہ کے لیے ہمارے نوجوان کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

عالیہ: اس سلسلہ میں ہمارے نوجوانوں کا کردار بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ نوجوانوں کو اس حقیقت سے آگاہ ہونا چاہیے کہ سامانِ زندگی ''زندگی'' نہیں ہے۔ بلکہ اس کی شریکِ حیات ہی اس کی زندگی کی رونق ہوتی ہے۔ والدین نے جس جگر پارے کو اٹھارہ بیس برس تک محنت کے ساتھ پرورش کر کے رخصت کیا ہے، تم اس محنت کو فراموش کر رہے ہو اور سامان کو ترجیح دے رہے ہو۔

عشرت: دراصل جہیز کی لعنت کی وجہ سے ہی گھریلو معاملات خراب ہوتے ہیں۔ دلہن کی ساس اور بہنیں طعنے دینا شروع کر دیتی ہیں کہ جہیز میں کیا لائی ہو۔ خالی ہاتھ چلی آئی ہو۔ ایسی جلی کٹی باتیں ہی جھگڑے کا باعث بنتی ہیں۔

عالیہ: جی عشرت! تمھاری بات بالکل درست ہے۔ اصل میں یہ مسئلہ تب حل ہوگا کہ جب ہم ساس بہو کے روایتی تصور سے نکلیں گے۔ جب بہو ساس کو ماں کا مقام اور نند کو بہن کا درجہ دے گی۔ اسی طرح ساس بھی اپنی بہو کو بیٹی سمجھے گی تو معاملات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔

عشرت: عالیہ بہن! حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ کو چند ضروری چیزیں دے کر رخصت فرمایا تھا، اس میں کیا حکمت تھی؟

عالیہ: عشرت بہن! نبی اکرم ﷺ کے ہر عمل میں حکمت و دانائی ہے۔ آپ ﷺ کو علم تھا کہ آنے والے زمانے میں ان کی امت اس بری رسم کا شکار ہوگی، اس لیے آپ ﷺ نے اپنی بیٹیؓ کو چند ضروری چیزیں عطا کیں تا کہ امت کے ہر فرد کے لیے عمل کرنا آسان ہو۔

عشرت: جہیز ایک رسمِ بد کی صورت میں ہمارے معاشرے میں پھیلتا جا رہا ہے، اس کے تدارک کے لیے معاشرے کے افراد کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

عالیہ : ہر فرد معاشرے کا اہم رکن ہے۔ معاشرے میں افراد کے ربط اور تعلق سے سلجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ معاشرت کا رویہ اپنائیں تو ایک بہترین معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ ورنہ صورتِ حال یہ ہو چکی ہے کہ غریب لڑکی جہیز نہ ہونے کی وجہ سے تمام عمر اپنے والدین کی دہلیز پر گزارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

بوڑھی ہوئی غریب کی بیٹی شباب میں
غربت نے رنگ روپ نکھرنے نہیں دیا

عشرت : ہر برائی قابلِ اصلاح ہوتی ہے۔ جہیز بھی ایک معاشرتی برائی ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے اساتذہ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

عالیہ : استاد کو شخصیت ساز کہا جاتا ہے۔ اساتذہ کرام اس سلسلے میں اپنے اداروں میں طلبہ و طالبات کی ذہن سازی کر کے بھرپور رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں۔

عشرت : دراصل ہم آپ ﷺ کی سیرت طیبہ پر عمل کر کے ہی اس مصیبت سے جان چھڑا سکتے ہیں۔

عالیہ : جی ہاں! بالکل بجا کہا ہے آپ نے حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی صرف ایک سنت سادگی کو اپنا کر ہی ہم زندگی کے بے شمار مسائل سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔

عشرت : عالیہ بہن! آج کی ہماری ملاقات اور گفتگو خوب رہی۔ آپ کی حکمت و دانائی سے معمور باتوں سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں اضافہ فرمائے۔

عالیہ : شکریہ عشرت! میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری قوم کی حالتِ زار پر رحم فرمائے اور ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

عشرت : آمین۔

عالیہ : اچھا بہن! اب میں چلتی ہوں بہت دیر ہو گئی ہے۔ امی جان گھر پر انتظار کر رہی ہوں گی۔

(عالیہ، عشرت سے اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔)

53 ٹیلی وژن کے ڈراموں کے متعلق دو سہیلیوں کے درمیان مکالمہ

(بہاول پور بورڈ 2005، لاہور، گوجرانوالہ 2015)

(زبیدہ اپنے کمرے میں ٹیلی ویژن پر ڈرامہ دیکھنے میں مشغول ہے۔ فاطمہ، زبیدہ سے ملنے کے لیے گھر آتی ہے اور یوں ہم کلام ہوتی ہے۔)

فاطمہ : السلام علیکم! زبیدہ کیا ہو رہا ہے؟

زبیدہ : وعلیکم السلام۔ فاطمہ! ڈرامہ دیکھ رہی ہوں۔ آکاش نامی ڈرامے کی شاید یہ آخری قسط ہے۔

فاطمہ : مجھے کیا لینا دینا ان ڈراموں سے؟

زبیدہ : کیوں تم نہیں دیکھتی؟

فاطمہ : نہیں مجھے ان سے قطعاً کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

زبیدہ : میرے خیال میں، میں نے پہلی لڑکی دیکھی ہے، جسے ڈراموں سے کوئی دل چسپی نہ ہو۔ تفریحِ طبع کا میرے خیال میں یہ ایک موزوں ذریعہ ہے۔

فاطمہ : یہ غلط فہمی ہے تمھاری۔

زبیدہ : (بوکھلاتے ہوئے) غلط فہمی، کیسی غلط فہمی؟

فاطمہ : بس چھوڑو۔ میں ان بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتی۔

زبیدہ : نہیں نہیں، تمھیں اب بتانا ہوگا۔

فاطمہ : اچھا تو سنو مسئلہ یہ ہے کہ ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے ڈراموں کا حقیقت سے تعلق کم ہوتا ہے۔ یہ ڈرامے پاکستانی عوام کی صحیح نمائندگی کرنے سے قاصر ہیں۔

زبیدہ : میں سمجھ نہیں سکی۔

فاطمہ : دیکھو: ٹیلی ویژن پر جتنے بھی ڈرامے دکھائے جاتے ہیں۔ ان میں سے نوے فیصد ڈرامے ایسے ہوتے ہیں جو نہایت ہی عالی شان بنگلوں میں، بڑے شہروں کی چند ایک صاف ستھری سڑکوں پر، معیاری سجاوٹ و آرائش سے مزین کوٹھیوں میں بنائے جاتے ہیں۔

زبیدہ : مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ آخر ڈرامہ ایسی ہی جگہ پر بنانا چاہیے۔

فاطمہ : نہیں بالکل نہیں! ڈرامہ ایسی جگہ پر بنانا چاہیے جو درمیانے طبقے کی رہائش کی نمائندہ ہو اور جو ہمارے ماحول اور معاشرے کی صحیح عکاسی بھی کر سکے۔

زبیدہ : لیکن اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟

فاطمہ : اس سے کئی نقصانات ہوتے ہیں۔ ایک طرف غربا اور متوسط طبقے کے لوگوں میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے اور انھیں اپنے معیارِ زندگی کو اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کے لیے اکسایا جاتا ہے، تو دوسری طرف معاشرے کی کھوکھلی تصویر دنیا کو دکھائی جاتی ہے۔

زبیدہ : ہاں! ہاں بالکل! اسی طرح کے احساسات واقعی پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں نے تو آج تک ایسا محسوس نہیں کیا۔

فاطمہ : (ہنستے ہوئے) تم نے کیا محسوس کرنا تھا۔ تم لوگوں کے پاس اپنا بنگلہ، کار، زمینیں سب کچھ تو ہے۔

زبیدہ : شاید! ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو۔

فاطمہ : لیکن ان ڈراموں کا ایک اور بڑا المیہ یہ ہے کہ تمام ڈرامے جو پیش ہوتے ہیں، فحاشی و عریانی کو فروغ دیتے ہیں۔

زبیدہ : وہ کیسے؟

فاطمہ : دیکھو بھئی! ڈرامے میں جو کردار پیش کیے جاتے ہیں، ان کا لباس، گفتار تمام عریانی کے نمونے ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نوجوان نسل ان لوگوں کی طرح کے عادات و اطوار، وضع قطع، لباس، گفتار و کردار اپناتی ہے اور پھر نتیجہ تمھارے سامنے ہے کہ کس طرح نوجوان نسل آج تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔

زبیدہ : واقعی میں تمھاری ان باتوں کو تسلیم کرتی ہوں۔

فاطمہ : حکام کو چاہیے کہ ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے ڈراموں پر نظرِ ثانی کر کے پاکستانی معاشرے اور پاکستانی ثقافت کو اجاگر کرنے کا پابند بنائے اور سنسر بورڈ کو اتنا مضبوط بنائے کہ وہ اس قسم کی بے حیائی اور عریانی کا سدِ باب کر سکے کیوں کہ بقول صلاح الدین ایوبیؒ: "اگر کسی قوم کو بغیر جنگ کے شکست دینی ہو تو اس کے نوجوانوں میں فحاشی پھیلا دو"

زبیدہ : فاطمہ! تمھاری ان پر مغز باتوں نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔

فاطمہ : اللہ آپ کو جزا دے۔ دیر ہو رہی ہے میں چلتی ہوں۔ اللہ حافظ۔

زبیدہ : اللہ حافظ!

(فاطمہ، زبیدہ سے اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔)

54 دو دوستوں کے درمیان "سی پیک منصوبہ" کے بارے میں مکالمہ

(اکرم سٹی پارک میں بنچ پر بیٹھا ہوا ہے، اس کا دوست اسلم آتا ہے اور یوں ہم کلام ہوتا ہے۔)

اسلم: السلام علیکم! کیا حال ہے، خیریت سے ہیں؟

اکرم: وعلیکم السلام۔ اللہ کا شکر ہے، آپ سنائیں؟

اسلم: جی میں خیریت سے ہوں۔ آپ پارک میں کس وقت آئے تھے؟

اکرم: میں تقریباً ایک گھنٹہ قبل سیر کے لیے آیا تھا، تھکاوٹ ہو گئی تھی اس لیے بنچ پر بیٹھا ہوں۔

اسلم: اکرم بھائی! کافی دنوں کے بعد دکھائی دیے، آج کل آپ کہاں ہوتے ہیں؟

اکرم: اسلم بھائی! چین اور پاکستان کے درمیان اقتصادی راہداری میں ملازمت ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے صبح تا شام وہاں مصروف رہتا ہوں۔

اسلم: اکرم بھائی! سی پیک سے کیا مراد ہے؟

اکرم: سی پیک سے مراد۔ چائنہ پاکستان اکنامک کوریڈور ہے۔

اسلم: اس منصوبے کا مقصد کیا ہے؟

اکرم: اس منصوبے کا مقصد دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کو فروغ دینا ہے۔ اس منصوبے سے نہ صرف ان دونوں ممالک کے درمیان تجارت ہوگی بلکہ گوادر پورٹ سے پاکستان اور چین مل کر اپنی مصنوعات برآمد کر سکیں گے۔

اسلم: ہاں یار یہ تو ہے، جب یہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا تو پاکستان کی قسمت ہی بدل جائے گی۔

اکرم: بالکل! آپ نے ٹھیک کہا، کیوں کہ یہ ایک ایسا منصوبہ ہے، جس کی وجہ سے پاکستان ایک مضبوط صنعتی طاقت بن سکتا ہے۔

اسلم: اس منصوبے سے پاکستان کو اور کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟

اکرم: اس کے تحت پاکستان میں آمد و رفت کا نظام تیز تر ہو جائے گا جس کی وجہ سے برآمدات میں تیزی آئے گی اور پاکستان زیادہ سے زیادہ زرِ مبادلہ کما سکے گا۔

اسلم: پھر تو اس منصوبے کو جلد از جلد مکمل ہو جانا چاہیے، تاکہ اس سے ہمارا ملک بھرپور فائدہ اٹھا سکے۔

اکرم: جی بالکل! قرآن و حدیث میں بھی تجارت کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور یہی وہ پیشہ ہے، جس سے ہمارا ملک ترقی یافتہ بن سکتا ہے۔

اسلم: اس منصوبے سے چین کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟

اکرم: اس منصوبے سے چین کا تجارتی فاصلہ کم ہو جائے گا اور اس طرح پاکستان اور چین مل کر اس کم تجارتی فاصلے سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اسلم: کیا تمھارے خیال میں پاکستان کے دشمن ممالک ایسا ہونے دیں گے؟

اکرم: ہمارے دشمن اس منصوبے کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ دراصل یہ متعصب ممالک کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ پاکستان ترقی کی منازل طے کرے۔

اسلم: دشمن ممالک کو ایسا کرنے سے کیا ملتا ہے؟

اکرم: دراصل ہمارے دشمنوں سے ہماری ترقی برداشت نہیں ہوتی اور وہ چاہتے ہیں کہ ہم ایسے ہی محرومی کی زندگی بسر کرتے رہیں۔

اسلم: کیا اسی وجہ سے یہ دشمن ممالک ہمارے ملک میں افراتفری پھیلا رہے ہیں؟

اکرم: جی ہاں! یہ ممالک بھی ہمارے ملک میں دھماکے کراتے ہیں، تو کبھی کشمیر پر اپنا حق جتاتے ہیں۔

اسلم: اس منصوبے کو ناکام بنانے والوں کے لیے ہماری حکومت کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

اکرم: ہماری حکومت کو چاہیے کہ دوست دشمن کی پہچان کریں۔ خاص طور پر وہ ممالک جو کہ اسلام کے کھلے دشمن ہیں، ان کی حمایت کرنا چھوڑ دیں اور بہترین خارجہ پالیسی کے ذریعے دشمن کا سیاہ چہرہ پوری دنیا کو دکھائیں۔

اسلم: اس کے علاوہ عوام الناس کی کیا ذمہ داری ہے؟

اکرم: عوام کو چاہیے کہ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے متحد ہو جائیں، کیوں کہ مولانا ظفر علی خاں فرماتے ہیں:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی — نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اسلم: یار اکرم! آپ کے بیان کردہ اصل حقائق نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

اکرم: دعا کرو اسلم: اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو مزید ترقی عطا فرمائے۔

اسلم: آمین۔

اکرم: اب ہمیں گھر چلنا چاہیے۔

(دونوں دوست اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں)

55 قلی اور مسافر کے درمیان مکالمہ

(بہاول پور بورڈ 2017ء)

(ایک بزرگ مسافر خان پور سے لاہور جانے کے لیے رکشہ میں سوار ہو کر اسٹیشن پر پہنچتا ہے۔ کافی وزنی سامان اس کے ہمراہ ہے۔ وہ رکشہ سے اُتر کر قلی کو پکارتا ہے۔)

مسافر: قلی! ارے قلی! ادھر آنا بھئی۔

قلی: جی جناب! فرمائیے، میرے لیے کیا حکم ہے؟

مسافر: یہ سامان پلیٹ فارم پر پہنچانا ہے۔

قلی: سامان پلیٹ فارم تک ہی پہنچانا ہے نا، صاحب جی!

مسافر: سامان پلیٹ فارم پر رکھنا ہے اور جب گاڑی آ جائے گی تو پھر یہ سامان بھی گاڑی میں رکھنا ہے۔

قلی: صاحب جی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ مگر اس کے پیسے اضافی ہوں گے۔

مسافر: جی بتائیے کتنے پیسے لیں گے؟

قلی: جناب! پلیٹ فارم تک پہنچانے کے تین سو روپے اور گاڑی میں رکھنے کے سو روپے اضافی ہوں گے۔

مسافر: ارے بھئی قلی! یہ پیسے تو بہت زیادہ ہیں۔

قلی: نہیں جناب! آپ کا سامان بھی تو بہت زیادہ ہے۔

مسافر: نہیں بھئی! سامان اتنا زیادہ تو نہیں ہے۔ ایک بستر ہے، ایک بیگ ہے اور ایک عدد اٹیچی کیس ہے۔

قلی: جناب! پھر بھی سامان تو ہے نا!

مسافر: اچھا بھئی! مناسب پیسے لے لو!

قلی: بس جناب! مہنگائی کی شدت آپ کے سامنے ہے۔ اس نے ہم غریبوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔

مسافر: اچھا بھئی قلی! تنقید و تبصرہ چھوڑو اور بتاؤ کہ بارعایت کتنے روپے ہوں گے۔

قلی: جناب! رعایت کی گنجائش تو نہیں ہے۔ چلو آپ بزرگ ہیں۔ آپ کا لحاظ کرتے ہوئے تین سو پچاس روپے ہوں گے۔

مسافر: یہ پیسے بھی بہت زیادہ ہیں، کچھ تو لحاظ کرو۔

قلی: نہیں جناب! اس سے کم نہیں ہوں گے۔ آپ کا سامان زیادہ ہے۔

مسافر: اچھا بھئی! دو سو پچاس روپے لو اور منزل پر پہنچا دو۔

قلی: نہیں جناب! پہلے بھی آپ سے عرض کیا ہے کہ مہنگائی بہت زیادہ ہے اور چیزوں کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ چلیں آپ تین سو روپے دے دیجیے گا۔ اس سے ایک روپیہ بھی کم نہیں لوں گا۔

مسافر: (حیرت سے) تین سو روپے! کیا آج کی پوری دیہاڑی میری جیب سے نکالنے کا ارادہ ہے۔

قلی: نہیں جناب! میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے۔ دراصل ریل گاڑیاں وقت پر نہیں آتیں۔ جس کی وجہ سے ہمیں دن رات اسٹیشن پر خوار ہونا پڑتا ہے۔

مسافر: چلو بہتر ہے۔ سامان اٹھاؤ اور دھیان سے اٹھانا، کہیں کوئی چیز ٹوٹ نہ جائے۔

قلی: جناب! آپ بے فکر رہیں۔ سامان حفاظت سے پلیٹ فارم پر پہنچاؤں گا۔

مسافر: اچھا بھئی قلی! میں ٹکٹ گھر سے ٹکٹ لے لوں۔ آپ سامان اٹھا لیں۔

قلی: صاحب جی! آپ ٹکٹ کی فکر نہ کریں، میں لا دوں گا۔ ٹکٹ گھر کے سامنے بھیڑ ہے۔ آپ بزرگ ہیں، آپ کو پریشانی ہوگی۔ چلیں آپ بنچ پر تشریف رکھیں۔

مسافر: (مسافر آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کی طرف چل پڑتا ہے) شکریہ بیٹا۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔

قلی: جناب کوئی بات نہیں۔ آپ بزرگ ہیں، آپ کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔

مسافر: کسی بھلے گھر کے معلوم ہوتے ہو۔

قلی: جی جناب! میرے والد صاحب بھی ریٹائرڈ ریلوے ملازم ہیں۔

مسافر: اللہ تعالیٰ ان کا سایہ آپ کے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے۔ آج پلیٹ فارم پر کافی بھیڑ دکھائی دے رہی ہے۔

قلی: جی صاحب! ادھر آئیے۔ آپ یہاں بنچ پر بیٹھیں۔ میں ابھی ٹکٹ لے کر آتا ہوں۔

مسافر: جی بیٹا، ٹھیک ہے، میں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔

قلی: (تھوڑی دیر میں ٹکٹ لے کر آجاتا ہے) یہ لیجیے جناب ٹکٹ۔ اور گاڑی بھی تقریباً آدھا گھنٹہ تاخیر سے آئے گی۔

مسافر: اوہو! آدھا گھنٹہ تاخیر سے آئے گی؟

قلی: شکر کریں جناب! آدھا گھنٹہ تاخیر سے آرہی ہے، ورنہ آج کل تو گاڑیاں پانچ پانچ گھنٹے بھی تاخیر سے آرہی ہیں۔

مسافر: اچھا بھئی! تھوڑی دیر انتظار کر لیتے ہیں۔

قلی: (چند لمحوں کے بعد گھنٹی بجتی ہے) لو جناب! انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، گاڑی آیا ہی چاہتی ہے۔

مسافر: اچھا بھئی! یہ لو اپنے تیس سو روپے مزدوری کے۔

قلی: شکریہ جناب! صاحب جی، گاڑی نظر آنا شروع ہوگئی ہے۔

مسافر: (تھوڑی دیر میں گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رکتی ہے) قلی بھئی! یہ سامان اٹھاؤ گاڑی میں رکھو، اور دھیان سے اٹھانا۔

قلی: جی جناب! بہتر (قلی سامان اٹھاتا ہے) آیئے صاحب، یہ سیٹ خالی ہے۔ آپ یہاں تشریف رکھیں، میں سامان سیٹ کے نیچے رکھ دیتا ہوں۔

مسافر: ٹھیک ہے، آپ یہاں سیٹ کے نیچے ہی رکھ دیں۔

قلی: اچھا صاحب! گاڑی روانہ ہونے والی ہے۔ اپنے سامان کی تسلی کر لیں۔ مجھے اجازت دیں۔ اللہ حافظ۔

مسافر: شکریہ بیٹا! اللہ حافظ۔

(قلی، مسافر سے اجازت لے کر گاڑی سے نیچے اتر جاتا ہے اور گاڑی بھی چل پڑتی ہے۔)

56 پیشے کے انتخاب کے سلسلہ میں باپ اور بیٹے کے درمیان مکالمہ

(والد محترم گھر میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہوتے ہیں کہ اُن کا بیٹا حارث آجاتا ہے اور ہم کلام ہوتا ہے۔)

حارث: السلام علیکم! ابو جان!

باپ: وعلیکم السلام! بیٹا خیریت تو ہے؟

حارث: جی ابا جان! میں آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

باپ: ہاں بیٹا، بتاؤ۔

حارث: اللہ کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں سے میرے میٹرک کے پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں ایف۔ ایس۔ سی پری میڈیکل میں داخلہ لے لوں تاکہ ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کر سکوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

باپ: (چند لمحے خاموشی کے بعد) بیٹا! میرا تو یہ خیال ہے کہ انجینئرنگ کر لو۔

حارث: ابا جان! کیا آپ جانتے ہیں کہ کتنے ہی انجینئر بے روزگاری کا شکار ہیں۔

باپ: میں نے تو اکثر انجینئروں کو برسرِ روزگار ہی دیکھا ہے۔

حارث: ابا جان! آپ نے صرف اُن لوگوں کو دیکھا ہے، جن کے پاس دولت یا سفارش ہوتی ہے، تعلیمی سند تو ان لوگوں کے سامنے صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے جو رشوت اور سفارش کے سامنے بے وقعت ہے۔ حالاں کہ حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ "رشوت لینے والا اور دینے والا (دونوں) جہنمی ہیں" (طبرانی)

باپ: ہاں بیٹا! یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ دراصل رشوت اور سفارش نے ہمارے معاشرے کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس طرح سے اہل اور حق داروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

حارث: اسی لیے تو میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔

باپ: میں نے سنا ہے کہ انجینئرنگ کی ڈگری دوسرے ممالک میں خاص اہمیت رکھتی ہے اور وہاں جا کر یہی انجینئر لاکھوں روپے کماتے ہیں۔

حارث: جی ابا جان! مگر میں اپنے ملک میں رہ کر اپنے عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے لیے تو ہر شخص جیتا ہے مگر انسانیت کی معراج تو اس میں ہے کہ انسان دوسروں کے کام آئے۔

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

باپ: پھر بھی ابا جان! آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ آپ میرے لیے جو بھی فیصلہ صادر فرمائیں گے، وہ میرے حق میں بہتر ہوگا۔

حارث: بیٹا! اگر خدانخواستہ تمھارا داخلہ میڈیکل کالج میں نہ ہو سکا تو پھر کیا کرو گے۔

باپ: ابا جان! آپ ناامید نہ ہوں۔ میں خوب محنت کروں گا۔ آپ کی دعاؤں سے میں ان شاء اللہ کامیاب ہو جاؤں گا۔ کیوں کہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا

حارث: ٹھیک ہے بیٹا! اللہ تمھیں اپنے نیک ارادوں میں کامیاب کرے۔

باپ: ابا جان! آپ فکر مند نہ ہوں۔ ان شاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب آپ کا لختِ جگر ڈاکٹر کہلائے گا۔

حارث: ان شاء اللہ۔ اچھا بیٹا، مجھے ایک ضروری کام کے سلسلہ میں بازار جانا ہے۔ میں چلتا ہوں، شام کو دوبارہ ملیں گے۔

باپ: ٹھیک ہے ابا جان! اللہ حافظ۔

حارث: اللہ حافظ بیٹا۔

(والد صاحب کام کے سلسلہ میں گھر سے باہر چلے جاتے ہیں۔)

57 دو دوستوں میں بسوں کے کرائے میں رعایت پر مکالمہ

(ڈیرہ غازی خان 17)

(ساجد اور اکرام دونوں دوست ہیں۔ ساجد اپنی سائیکل پر کالج جا رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کی نظر اکرام پر پڑتی ہے جو کہ بس اسٹینڈ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا ہے، ساجد، اکرام کے پاس آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

ساجد: السلام علیکم! اکرام بھائی کیا حال ہے؟

اکرام: وعلیکم السلام۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ساجد: کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے۔

اکرام: ہاں یار! ابھی تک بس نہیں آئی اور پہلا لیکچر شروع ہونے میں صرف بیس منٹ رہتے ہیں۔

ساجد: اگر بس نہ آئی تو آپ بے بس ہو جائیں گے۔

اکرام: یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بس والے اتنی تاخیر کیوں کرتے ہیں۔ انھیں وقت کی پابندی کرنی چاہیے۔

ساجد: بھائی! بس والوں نے تو صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ "جلدی والے حضرات رکشہ پر چلے جائیں"۔ تو کیا یہ ضروری ہے کہ آپ بس پر ہی جائیں؟

اکرام: آپ کی بات درست ہے مگر بس میں ہمیں رعایتی ٹکٹ ملتا ہے۔

ساجد: یہ رعایت کی بات بھی خوب رہی! صبح کالج جاتے ہوئے دیر ہو جاتی ہے۔ شام کو گھر آتے ہوئے تاخیر۔ گھنٹوں بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرو اور جب بس آجائے تو لٹک کر سفر کرو۔

اکرام: بھائی آپ کو پتا ہے مہنگائی کا دور دورہ ہے اور جب حکومت نے یہ رعایت دی ہوئی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آپ اس رعایت کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟

ساجد: اس لیے کہ جب ہمارے والدین تعلیمی اخراجات برداشت کرتے ہیں تو سفر کے بھی برداشت کر سکتے ہیں۔

اکرام: ہاں یار! اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے۔

ساجد: آپ خود ہی بتائیں۔ کیا آپ کے والدین آپ کو آنے اور جانے کا کرایہ نہیں دیتے۔

اکرام: ضرور دیتے ہیں۔

ساجد: پھر آپ بسوں میں دھکے کیوں کھاتے ہیں۔ گھنٹوں بس اسٹاپ پر بس کا انتظار بھی کرتے ہیں اور جب بس آتی ہے تو اس پر بڑی مشکل سے سوار ہوتے ہو۔

اکرام: بس پر سوار ہونا ہمارا حق ہے اور کرائے میں حکومت نے جو رعایت دی ہوئی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ساجد: آپ لوگوں نے ڈرائیوروں کو اس قدر زچ کیا ہوا ہے کہ وہ اسٹاپ پر لڑکوں کو کھڑا دیکھ کر بس کو بھگا کر لے جاتے ہیں۔

اکرام: جب ڈرائیور ہمارے بہتے چڑھ جاتے ہیں تو ہم بھی دل کی بھڑاس خوب نکال لیتے ہیں۔

ساجد: یہ کوئی قابلِ تعریف فعل تو نہیں ہے نا۔

اکرام: دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں اس میں لطف آتا ہے۔

ساجد: یہ لطف آنے کی بات خوب رہی! یہ کوئی شرافت ہے سڑکوں پر بسوں کو روکو اور زبردستی ان میں سوار ہو جاؤ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس میں وقت کا ضیاع ہے اور ایک طالب علم کے لیے وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ طالب علم سفر ضرور کرے مگر وقار اور متانت کے ساتھ۔

اکرام: ہاں یار! یہ بات تو آپ کی درست ہے کہ ہم لوگ وقت پر کبھی نہیں پہنچ پاتے۔

ساجد: خدا کا شکر ہے کہ میری بات آپ کی سمجھ میں آ گئی، اب مجھے دیکھو اپنی سائیکل پر کالج آتا اور جاتا ہوں، کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

اکرام: پھر تو آج ہی میں اپنے والد صاحب سے سائیکل خریدنے کے لیے کہتا ہوں۔ انھوں نے مجھے سائیکل دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔

ساجد: بہت اچھی بات ہے "اپنی مدد آپ" کے تحت آپ بھی سائیکل لو اور وقت پر کالج جاؤ۔

اکرام: ہاں یار! آپ کی بات بالکل درست ہے۔ اور امتحان میں اگر اچھے نمبر آ گئے تو والد صاحب مجھے موٹر سائیکل انعام میں دیں گے۔

ساجد: یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ کو چاہیے کہ خوب دل لگا کر محنت سے پڑھو اور کامیابی حاصل کرو۔

اکرام: ان شاء اللہ۔ اب میں اور زیادہ محنت کروں گا تاکہ جلد ہی اپنی سواری لے سکوں اور بسوں میں دھکے کھانے سے بچ جاؤں۔

ساجد: ہاں یار! ہمیں اپنے مقصد پر ضرور نگاہ رکھنی چاہیے، بسوں کے کرائے کم ہوں یا زیادہ، ہمیں اس سے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔

اکرام: شکریہ، آپ نے آج بہت مفید باتیں بتائیں۔

ساجد: کوئی بات نہیں۔ اب میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ

اکرام: اللہ حافظ

(ساجد، اکرام سے اجازت لے کر اپنے کالج کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

58 امتحان میں نقل کے بڑھتے ہوئے رجحان پر مکالمہ

(نوید کالج کے میدان میں بیٹھا ہوا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد اس کا دوست راشد بھی آ جاتا ہے۔ وہ نوید سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

راشد: السلام علیکم!

نوید: وعلیکم السلام!

راشد: کیا بات ہے؟ پریشان نظر آ رہے ہو۔

نوید: ہاں بھائی! امتحان سر پر ہے، اس کی تیاری کے حوالے سے پریشان ہوں۔

راشد: کیوں کیا بات ہے۔ کیا تیاری نہیں کی تھی؟

نوید: بھائی صاحب! جتنی اچھی تیاری کر لو اور جتنی محنت کر لو، کامیاب وہی ہوتے ہیں جو نقل لگاتے ہیں۔

راشد: آپ کی بات کسی حد تک درست ہے لیکن "محنت میں عظمت ہے" آپ محنت کرتے رہو، ان شاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

نوید: لیکن میں نے تو سوچ لیا ہے کہ اس بار میں بھی "بوٹی" ساتھ لے جاؤں گا۔ آج کل کون نہیں لے جاتا۔ میں لے گیا تو کون سا ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔

راشد: آپ کی یہ غلط سوچ ہے بھائی! کوئی بھی ناجائز کام، اس لیے جائز نہیں ہو جاتا کہ اسے دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں۔

نوید: جب امتحان سر پر ہو اور تیاری نامکمل ہو تو بندہ کیا کرے؟

راشد: ایسا اس وقت ہوتا ہے کہ جب بندہ روزانہ کا کام روزانہ نہ کرے تو امتحان کی تیاری میں مشکل پیش آتی ہے۔ ہاں اگر محنت شروع سے کی جائے تو امتحان میں آسانی ہو جاتی ہے اور پھر طالب علم کو کسی قسم کی نقل کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

نوید: اب سب لوگ آپ کی طرح ذہین تو نہیں ہوتے اور آج کل تو نقل لگانے کا دھندہ زور شور سے چل رہا ہے۔ یہ تماشا اب عام ہو رہا ہے۔

راشد: یہی تو المیہ ہے۔ اگر اسے ایک طالب علم کرے تب بھی جرم ہے اور اگر بہت سے طالب علم کریں تب بھی جرم ہے۔ ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے تمھارا فرض ہے کہ نصاب کی کتابوں کا بغور مطالعہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو دماغ دیا ہے، اسے استعمال کرنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ جو بھی پڑھو، سوچ سمجھ کر پڑھو اور ذہن نشین کر لو۔

نوید: لیکن ہر وقت نصابی کتب پڑھنا بھی بے حد مشکل ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ گھر میں تو سرے سے وقت ہی نہیں ملتا۔ کبھی ٹی وی پر کوئی پروگرام شروع ہو جاتا ہے تو کبھی کیبل پر فلم اور صبح اس وقت آنکھ کھلتی ہے جب سورج نکل آتا ہے۔

راشد: اگر گھر میں تمھارا یہ حال ہے تو امتحان میں نقل لگا کر بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ امتحان میں بوٹیوں کا سہارا لیتے ہیں، ان میں سے اکثر طلبہ بہت اچھے نمبرز کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ تمھیں چاہیے کہ نئے سرے سے سنجیدگی کے ساتھ دوبارہ تیاری شروع کرو اور نقل لگانے کا خیال دل سے نکال دو۔ اسی میں تمھاری بھلائی اور کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

نوید: یار! آپ کی باتیں دل کو لگی ہیں۔

راشد: جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں اس کے لیے اساتذہ کرام سے مدد لو۔ اس کے علاوہ تمھیں کسی بھی مضمون میں مشکل ہو تو بتا دیا کرو میں خدمت کے لیے حاضر ہوں۔

نوید: شکریہ راشد بھائی! آپ نے مجھے بہت مفید باتیں بتائی ہیں۔ ان شاء اللہ میں ضرور عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔

راشد: کوئی بات نہیں! بس آپ ایک اچھے طالب علم کی طرح اپنے والدین اور اساتذہ کرام کی مفید ہدایات پر عمل پیرا ہو کر امتحان کی تیاری کرو اور امتحان میں نقل لگانے کی جو وبا پھیل رہی ہے، اس سے بچنے کی کوشش کرو۔

نوید: بہت شکریہ! آپ نے میری اصلاح کر دی۔ ان شاء اللہ اب میں امتحان بھرپور تیاری کر کے دوں گا۔

راشد: اللہ تعالیٰ آپ کو محنت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور محکمہ تعلیم کو بھی چاہیے کہ بہتر اور جامع اصلاحات نافذ کرے اور امتحان میں چیکنگ کا نظام درست کیا جائے تاکہ طلبہ کی حق تلفی نہ ہو۔

نوید: شکریہ راشد بھائی۔

راشد: (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا یار اب میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ

نوید: اللہ حافظ

(راشد، نوید سے اجازت لے کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

59 دو دوستوں میں پرائمری سطح پر انگریزی لازمی کرنے پر مکالمہ

(اسامہ اور نوید دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔ وقفہ کے دوران میں اسامہ کالج کے صحن میں بیٹھا کسی کتاب کے مطالعہ میں محو ہے، نوید اس کے پاس آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

نوید: السلام علیکم!

اسامہ: وعلیکم السلام! نوید بھائی کیسے ہیں؟

نوید: الحمدللہ! میں ٹھیک ہوں۔ کون سی کتاب کا مطالعہ ہو رہا ہے؟

اسامہ: ہماری قومی زبان اردو سے متعلق ہے۔ اس میں اردو کی اہمیت و ضرورت بیان کی گئی ہے۔

نوید: اب تو انگلش کا دور دورہ ہے، اور آپ اردو میں سر کھپا رہے ہیں۔

اسامہ: یہ آپ کی غلط فہمی ہے، دراصل انگریزی زبان فیشن بن چکی ہے اور ہر خاص و عام انگلش سے مرعوب دکھائی دیتا ہے۔

نوید: آپ پتا نہیں کون سی دنیا میں رہتے ہیں، اب تو حکومت نے پرائمری سطح پر بھی تمام مضامین انگریزی زبان میں کر دیے ہیں۔

اسامہ: میرے خیال میں تو یہ سب غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں قومی زبان کو رائج کیا گیا ہے، ایک ہمارا ملک ایسا ہے کہ جہاں انگریزی زبان کو ترجیح دی جاتی ہے۔

نوید: گویا آپ کے خیال میں انگریزی پڑھنا فضول ہے۔
اسامہ: فضول نہیں! لیکن ہر شخص کو انگریزی پڑھانے کا فائدہ؟
نوید: آج کل تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی روانی سے انگریزی بولتے ہیں۔
اسامہ: زندہ قومیں اپنی قومی زبان سے محبت کرتی ہیں اور اس کی ترقی کے لیے کوشش بھی کرتی ہیں۔
نوید: اگر ایسا ہے تو پھر پرائمری سطح پر انگریزی زبان کو کیوں لازمی کیا جا رہا ہے؟
اسامہ: یہ سب مرعوبیت کی وجہ سے ہے۔ غلامانہ ذہنیت کی حامل قوموں کا یہ المیہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسروں کی زبان سیکھنے اور بولنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔
نوید: تو پھر ترقی کیسے ہوگی؟ جدید علوم تو اسی زبان میں ہیں۔
اسامہ: ترقی ہمیشہ اپنی ہی زبان میں ہوتی ہے، چین اور جاپان اس کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ تو بالکل نامناسب ہے کہ پرائمری سطح پر انگریزی لازمی کر دی جائے اور بچوں کو انگریزی پڑھانا شروع کر دیں۔
نوید: ہمارے ہاں تو ایک بڑا طبقہ انگریزی زبان کا دل دادہ ہے اور اہلِ اقتدار تو انگلش سیکھنے کی غرض سے اپنے بچوں کو بیرونِ ملک بھجواتے ہیں۔
اسامہ: ضرورت کے تحت انگلش سیکھنا اور پڑھنا منع نہیں ہے لیکن انگلش کو عام بول چال میں رائج کرنا اور اردو کو حقیر سمجھنا غلط ہے۔
نوید: دراصل انگریزی بولنے والے کو تعلیم یافتہ سمجھا جاتا ہے اور انگریزی کو سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں عام بول چال میں استعمال کیا جاتا ہے۔
اسامہ: ترقی ہمیشہ اپنی زبان میں ہوتی ہے۔ زبانیں علم نہیں ہیں۔ علم کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اردو زبان کی اہمیت و افادیت تسلیم شدہ ہے۔
نوید: ہمارے ہاں تو پرائمری سطح پر بھی انگریزی کو لازمی کر دیا گیا ہے۔
اسامہ: یہ ہمارے احساسِ کمتری کا واضح ثبوت ہے۔
نوید: آپ کی باتوں میں وزن ہے اور دل کو لگ رہی ہیں۔
اسامہ: آپ کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ اردو زبان بھی اس وقت دنیا میں بولی جانے والی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔
نوید: حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے اقدامات کرے۔
اسامہ: ایسا ہی ہونا چاہیے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت انگریزی کی بجائے اردو زبان کو رائج کرے۔
نوید: بالکل ٹھیک کہا! حکومت کا فرض بنتا ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے اقدامات کرے۔
اسامہ: نوید بھائی! فرانس، جرمنی، روس، چین، جاپان سب نے اپنی قومی زبان کو اہمیت دی اور ترقی کی لیکن یہاں تو ابتدائی جماعتوں میں انگریزی کو لازمی کر دیا گیا ہے۔
نوید: میرے خیال میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ترقی ہمیشہ اپنی زبان سے ہوتی ہے۔
اسامہ: جی بالکل! آپ یہ دیکھیں کہ فرانس، روس، جرمنی، چین اور جاپان میں انگریزی لازمی نہیں اور وہ ترقی یافتہ ہیں تو ہم کیوں نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا میرے خیال میں انگریزی کو پرائمری سطح پر لازمی کرنا نامناسب ہے۔
نوید: بھائی! آپ کی باتیں سن کر خوشی ہوئی۔ آپ کی معلومات اور سوچ اچھی ہے۔
اسامہ: بہت شکریہ نوید، ہمیں اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔
نوید: جی ہاں! اور میرے خیال میں بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری اور قومی زبان میں دی جائے۔
اسامہ: آپ کی بات درست ہے۔ شکر ہے میری بات آپ کی سمجھ میں آ گئی۔
نوید: آپ کی باتوں سے میرا دل مطمئن ہوا ہے۔
اسامہ: اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے میری باتیں دھیان سے سنیں۔
نوید: اچھا اب اجازت دیں، کلاس کا وقت ہو گیا ہے۔

اسامہ: اللہ حافظ!
(نوید، اسامہ سے اجازت لے کر اپنی جماعت کے کمرے کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

60 دو دوستوں کے درمیان بسنت کے موضوع پر مکالمہ

(وسیم اور عرفان دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔ عرفان وقفہ کے دوران میں کالج کے صحن میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ وسیم اس کے پاس آتا ہے اور دونوں میں گفتگو کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے۔)

وسیم: السلام علیکم!
عرفان: وعلیکم السلام!
وسیم: کیسے ہو عرفان؟
عرفان: میں ٹھیک ہوں۔
وسیم: کیا بات ہے، آج بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو؟
عرفان: (مسکراتے ہوئے) بھئی کل تو لطف آ جائے گا۔
وسیم: کس بات کا لطف؟
عرفان: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ بسنت آ گئی ہے۔ کل ہی بسنت ہے۔ پتنگ اُڑانے میں خوب مزہ آئے گا۔
وسیم: یہ بسنت کیا ہے بھئی، یہ تو بس وقت کا ضیاع ہے۔
عرفان: آپ کو کیا معلوم کہ اس تہوار کی خوب صورتی کیا ہے اور اس کے لطف کیا ہیں۔ انشاءاللہ خاں انشا نے کیا خوب کہا ہے کہ:
تُو نے لگائی اب کی یہ کیا آگ اے بسنت   جس سے کہ دل کی آگ اُٹھے جاگ اے بسنت
وسیم: واہ! واہ! کیا بات ہے بھئی۔
عرفان: میں تو کہتا ہوں کہ چھت پر کھڑے ہو کر پتنگ اُڑانے میں کتنا لطف ہے، ہر طرف نیلے نیلے، پیلے پیلے پتنگ اور "بوکاٹا" کا شور مچاتے ہوئے لوگ، جب حریفوں کے پتنگ کٹتے ہیں تو ہمیں کتنا سرور ملتا ہے! لگتا ہے تمھیں اس کا تجربہ نہیں ہے ورنہ۔
وسیم: ورنہ کیا!
عرفان: ورنہ تم بھی پتنگ بازی کے حوالے سے گیت گاتے، رقص کرتے اور شور غل مچاتے دکھائی دیتے۔
وسیم: میرے نزدیک تو یہ ایک شیطانی فعل ہے۔
عرفان: بھئی شیطانی فعل کیسے ہو گیا؟ یہ تو ہمارا تہوار ہے۔
وسیم: اس تہوار میں تمھارے پتنگ بھی تو کٹتے ہوں گے؟
عرفان: یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج تک کسی نے میرا پتنگ کاٹا ہو، کیوں کہ میں فولادی تار والی ڈور استعمال کرتا ہوں۔
وسیم: وہ کیسی فولادی تار والی ڈور ہے جو کٹنے کا نام نہیں لیتی؟
عرفان: تم بھی احمق ہو! بھلا فولادی تار والی ڈور بھی عام ڈوروں سے کٹتی ہے؟
وسیم: مان لیتا ہوں۔ لیکن اس ڈور کے بہت سے نقصانات بھی تو ہیں۔ جب پتنگ اُڑاتے ہیں تو یہ ڈور برقی تاروں سے بھی تو ٹکرا سکتی ہے۔
عرفان: اب میں تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ آسمان سے باتیں کرتا ہوا پتنگ اور اس کی ڈور کیسے ٹکرا سکتی ہے۔
وسیم: بعض اوقات ہچکولے کھاتا ہوا پتنگ نیچے بھی تو آ سکتا ہے، جس سے یہ جان لیوا بھی تو ہو سکتا ہے۔
عرفان: تم تو بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو۔ یہ تہوار تو ایسے ہی ہنستے مسکراتے گزر جاتا ہے۔
وسیم: ایسے کا کیا مطلب۔ اگر خدانخواستہ پتنگ کی فولادی تار والی ڈور کہیں کسی چوراہے یا گلی میں لٹک گئی تو وہ کسی حادثے کا سبب بھی بن سکتی ہے، تو پھر تم کیا کرو گے؟
عرفان: یار تم بھی کیسی پاگل پن کی باتیں کر رہے ہو۔ میں خوشیوں کی باتیں کرتا ہوں اور تم ہو کہ خوف اور مایوسی کی باتیں کرتے ہو۔
وسیم: پاگل پن کی باتیں تمھاری ہیں، جو اپنے نقصان میں بھی فائدہ تلاش کرتے ہو۔

عرفان: تمھاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

وسیم: میری باتیں تمھیں اس وقت سمجھ میں آئیں گی، جب تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔

عرفان: بددعائیں کیوں دے رہے ہو، ذرا وضاحت ہی کردو۔

وسیم: دیکھو بھئی! پتنگ بازی ایک ایسا عمل ہے، جس کے سراسر نقصانات ہی ہیں۔ تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اس شوق نے کتنے لوگوں کو معذور کیا ہے اور کتنے ہی لوگ اس کی بدولت اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

عرفان: یار! تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن یہ تو میرا کبھی کبھار کا شوق ہے۔ روزانہ کا معمول تو نہیں ہے۔

وسیم: یہی تو دُکھ کی بات ہے کہ یہ فعل جہاں دوسروں کے لیے مصیبت کا باعث بنتا ہے، وہاں تمھارے قیمتی وقت کے ضیاع کا سبب بھی بنتا ہے۔ اس قیمتی وقت کا احساس تمھیں اس وقت ہوگا جب تمھارے سالانہ امتحان ہوں گے۔

عرفان: وسیم، تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔ تمھاری ان پُرمغز اور پُرخلوص باتوں نے میری آنکھوں سے غفلت کا پردہ ہٹا دیا ہے۔ آئندہ میں کبھی بھی پتنگ بازی میں حصہ نہیں لوں گا۔

وسیم: اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔ اُردو کے لیکچر کا وقت ہُوا چاہتا ہے۔ ہمیں جماعت کے کمرے میں چلنا چاہیے۔

عرفان: جی وسیم بھائی۔ آؤ چلیں۔

(دونوں طالب علم اپنی جماعت کے کمرے کی طرف چل پڑتے ہیں۔)

61 محنت کی عظمت اور علم کے فوائد کے بارے میں دو دوستوں کے مابین مکالمہ

(ڈیرہ غازی خان 2017ء، بہاول پور بورڈ 18)

(شعیب ایم۔ اے اُردو سالِ دوم کا طالب علم لائبریری میں بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کا دوست اعجاز احمد جو کہ بارھویں جماعت کا طلب علم ہے، اس کے پاس آتا ہے اور ہم کلام ہوتا ہے۔)

اعجاز احمد: السلام علیکم! شعیب بھائی، آپ خیریت سے ہیں؟

شعیب: وعلیکم السلام! اللہ کا شکر ہے، آپ سنائیں پڑھائی ٹھیک ہو رہی ہے؟

اعجاز احمد: جی ہاں! جناب۔ اب تو امتحان بھی قریب آ گئے ہیں۔

شعیب: پھر تو آپ کو اور زیادہ محنت کرنی چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ آپ خوب دل لگا کر محنت کر رہے ہوں گے۔

اعجاز احمد: حقیقت تو یہ ہے جناب کہ گھر پر تیاری کا وقت نہیں ملتا۔ کالج سے تھک کر آتے ہیں تو پڑھنے کو دل ہی نہیں کرتا۔

شعیب: دیکھو بھئی! اگر آپ اعلیٰ مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو محنت کریں۔ جو لوگ محنت سے جی چراتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

اعجاز احمد: آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن کچھ کھیل کود اور سیر و تفریح بھی تو ہونی چاہیے تاکہ پڑھائی سے ہونے والی تھکاوٹ دور ہو سکے۔

شعیب: تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کھیل کود اور سیر و تفریح ضرور کریں لیکن اپنے مقصد کو ہرگز نہ بھولیں۔ یاد رکھیں علم اور محنت ہی سے آپ کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ علم ایک ایسی دولت ہے جو انسان کو ہمیشہ عزت دلاتی ہے اور جن لوگوں نے محنت کو اپنا شعار بنایا، وہ ہمیشہ کامیاب ہوئے۔ **بقول الطاف حسین حالی:**

سعادت، سیادت، عبادت ہے علم — بصیرت ہے، دولت ہے، طاقت ہے علم

اعجاز احمد: علم ہمیں کیا کیا فائدے دے سکتا ہے؟

شعیب: علم تو مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں ملے لے لو۔ علم کی بدولت ہمیں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ علم ہمیں معاشرے میں بلند مقام عطا کرتا ہے۔ علم ہمیں روزگار مہیا کرتا ہے۔ علم کی وجہ سے ہم باعزت زندگی گزار سکتے ہیں۔

اعجاز احمد: بے شک! اس بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا، لیکن کتنا علم حاصل کرنا چاہیے؟

شعیب: اتنا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے کہ جس سے انسان حلال اور حرام میں فرق کر سکے۔ جائز اور ناجائز امور کی پہچان کر سکے۔

اعجاز احمد: آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے، جاہل انسان تو اندھے کی طرح ہے جس کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔

شعیب: جی بالکل! علم ہی وہ جوہر ہے جو مخلوق کو خالق سے جوڑتا ہے اور اندھیروں کی وادیوں سے نکال کر روشنی کے شہر میں داخل کرتا ہے، جنت کا راستہ دکھاتا ہے اور جہنم سے دور کرتا ہے۔

اعجاز احمد: ہم علم کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

شعیب: علم کے حصول کے لیے علما کرام اور اپنے اساتذہ سے رابطہ رکھیں، مطالعہ کی عادت بنائیں اور سب سے بڑی بات خوب محنت کریں۔ کیوں کہ: ؎ بے شبہ جو علم کی دولت سے ہے خالی — کہنے کو بشر ہے، ہے بشریت سے خالی

اعجاز احمد: بے شک! یہ تو آپ نے بہت اچھی بات فرمائی۔ ان شاء اللہ اب میں پہلے سے بھی زیادہ محنت کروں گا۔

شعیب: تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی عظیم لوگ گزرے ہیں انھوں نے سخت محنت کی اور کامیاب ہوئے کیوں کہ ''محنت میں عظمت ہے'' اور علم حاصل کرنے کے لیے محنت اولین شرط ہے۔

اعجاز احمد: جناب آپ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے علم حاصل کرنا بے حد ضروری ہے اور علم حاصل کرنے کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

شعیب: ہاں بھئی! اگر آپ بلند مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اساتذہ اور ماں باپ کا نام روشن کرنا چاہتے ہیں تو محنت کرنا سیکھیں، جو لوگ محنت سے جی چراتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

اعجاز احمد: بے شک! بجا فرمایا۔

شعیب: دیکھو بھئی! یوں تو محنت دنیا کے ہر کام میں ضروری ہے مگر اس کی ضرورت و اہمیت حصولِ تعلیم کے سلسلے میں اور بھی زیادہ ہے۔

اعجاز احمد: جی بالکل! جناب آپ نے ایک دفعہ پہلے بھی بتایا تھا کہ علم ایک قیمتی چیز ہے جو دولت سے نہیں خریدی جا سکتی بلکہ شوق، محنت اور لگن سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

شعیب: شوق اور محنت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی اس میدان میں زیادہ کامیابی نصیب ہوگی۔ تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کوئی شخص علم کے میدان میں بغیر محنت کے کامیاب ہو گیا ہو۔ **بقول علامہ اقبالؒ:**

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اعجاز احمد: ان شاء اللہ۔ میں خوب دل لگا کر علم حاصل کروں گا اور محنت کو اپنا شعار بناؤں گا۔

شعیب: جو طالب علم محنت کرتے ہیں انھیں اس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ وہ نہ صرف تعلیم بلکہ زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی سے سرفراز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔

اعجاز احمد: جی بالکل! آپ میرے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ مجھے کامیابی عطا فرمائے۔

شعیب: اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کے ہر میدان میں ترقی دے اور مدد کرے، میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اعجاز احمد: آمین۔ آپ کا شکریہ، آپ نے انتہائی مفید، قیمتی اور پُرحکمت باتیں بتائیں۔

شعیب: کوئی بات نہیں بھائی! کافی دیر ہو گئی ہے، لیکچر شروع ہونے والا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔

اعجاز احمد: شکریہ بھائی! اللہ حافظ

(شعیب اپنی جماعت کے کمرے کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

62 ۱۔ دو طالب علموں کے درمیان انتخاب مضامین پر مکالمہ ۲۔ دو دوستوں کے درمیان آرٹس یا سائنس کے مضامین کے انتخاب پر مکالمہ

(سرگودھا 2015ء، ڈیرہ غازی خان بورڈ 2023)

(اویس اور عامر دونوں دوست ہیں، عامر اپنے دوست اویس سے ملنے کے لیے اس کے گھر آتا ہے اور اس سے یوں ہم کلام ہوتا ہے۔)

عامر: السلام علیکم!

اویس: وعلیکم السلام! آؤ عامر بھائی، کیسے ہو؟

عامر: الحمدللہ، میں ٹھیک ہُوں۔ آپ سنائیں کیا ہو رہا ہے، آج کل؟

اویس: سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟

عامر: بھائی صاحب، کیا بات ہے، کچھ بتاؤ گے تو سمجھ میں آئے گی بات۔

اویس: آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہوا ہے اور نتیجہ بھی جلد ہی آنے والا ہے۔

عامر: جی ہاں! مجھے پتا ہے اور نتیجہ بھی تقریباً دس یا بارہ دنوں میں آ جائے گا۔ لیکن اس میں سمجھ میں نہ آنے والی بات کون سی ہے؟

اویس: یار! دراصل مسئلہ انتخابِ مضامین کا ہے۔ سائنس مضامین پڑھوں یا آرٹس مضامین۔ میری خواہش ہے کہ میں آرٹس مضامین ہی لے لوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

عامر: ارے واہ بھئی! دنیا ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور آپ آرٹس مضامین پڑھیں گے۔

اویس: آپ ہی کوئی بہتر مشورہ دیں، میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔ میں آج کل بہت پریشان ہُوں۔

عامر: (ہنستے ہوئے) لگتا ہے کہ آپ اس پریشانی میں چل بسیں گے، فکر کریں اور ضرور کریں، لیکن کسی مسئلہ کو ذہن پر سوار نہیں کر لینا چاہیے۔

اویس: میں نے تو بس فیصلہ کر لیا ہے کہ آرٹس مضامین ہی پڑھوں گا۔

عامر: آپ کی سوچ کی سُوئی تو دماغ میں ایک ہی جگہ پر اٹکی ہوئی ہے۔ موجودہ دور تو سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت اہلِ مغرب ہی جدید علوم اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے ہم پر حاوی ہیں۔

اویس: یہ بھی تو حقیقت ہے کہ تاریخ کے مطالعہ کے بغیر کسی قوم کے افراد اپنی ثقافت سے کیسے آشنا ہو سکتے ہیں۔ سائنس سے تو واقعات کا پتا نہیں چلتا۔ کیا اہلِ مغرب کا ہم پلہ ہونے کے لیے ہم اپنی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کو خیر باد کہہ دیں۔

عامر: اویس بھئی! یہ بھی تو حقیقت ہے کہ جس طرح ایک سپاہی اسلحہ کے بغیر جنگ نہیں لڑ سکتا۔ اسی طرح ہم بھی موجودہ دور میں سائنس کی تعلیم حاصل کیے بغیر اقوامِ عالم کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔

اویس: بھائی آپ نے بجا فرمایا ہے، لیکن اگر کوئی طالب علم سیاسیات اور معاشیات نہیں پڑھے گا تو وہ ملک کے سیاسی اور معاشی حالات سے نا آشنا رہے گا۔

عامر: یہ بات تو تمھاری کسی حد تک درست ہے، لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ آج کا انسان سائنس و ٹیکنالوجی کی بدولت چاند پر پہنچ چکا ہے، لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔

اویس: بھئی یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن سائنس کی تعلیم حاصل کرنا ہماری ضرورت ہے۔ مگر سیاسیات اور معاشیات کے مضامین پڑھنا بھی بہت ضروری ہیں، کیوں کہ ان مضامین کے علم کے بغیر ملک کا سیاسی اور معاشی نظام کیسے درست ہو سکتا ہے؟

عامر: بھائی صاحب! ہمارے ملک میں حکومت تو بڑے بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار چلاتے ہیں۔ ایک عام طالب علم کو معاشیات اور سیاسیات پڑھ کر کیا حاصل ہوگا۔ جب کہ آرٹس مضامین پڑھنے والوں کے لیے روزگار کے مواقع بھی بہت کم ہوتے ہیں۔

اویس: اگر آرٹس مضامین پڑھنے والوں کو روزگار نہیں ملتا تو سائنس مضامین پڑھنے والے طالب علموں، خصوصاً انجینئرنگ کرنے والے طالب علموں کے بھی تو ملازمت کے مواقع کم ہوتے ہیں۔

عامر: یہ درست ہے کہ ایک انجینئر کے لیے روزگار کے مواقع کم ہوتے ہیں مگر ڈاکٹر کے لیے تو ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنی نجی پریکٹس بھی کر سکتا ہے۔

اویس: ارے بھئی! جہاں تک روزگار کا معاملہ ہے وہ اللہ کے اختیار میں ہے۔

عامر: (ہنستے ہوئے) آپ تو ضد کر بیٹھے ہیں۔ بہر حال اپنی اپنی سوچ ہے۔ میرا اب بھی آپ کو یہی مشورہ ہے کہ سائنس مضامین پڑھیں اور مضامین کے انتخاب کے سلسلہ میں لاپروائی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔

اویس: میں آپ کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ مضامین کے انتخاب کے سلسلے میں سوچ بچار کرنی چاہیے، لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ اگر سائنس کی طرف رُجحان نہ ہو تو آرٹس مضامین پڑھنا ہی بہتر ہے۔

عامر: آپ سائنس مضامین سے کچھ زیادہ ہی خائف ہو گئے ہیں۔

اویس: خوف زدہ ہونے کی بات ہرگز نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی بھی ملک کی ترقی کے لیے سائنس میں مہارت انتہائی ضروری ہے۔ مگر آرٹس مضامین کی اہمیت سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔

عامر: شکر ہے کوئی بات تو آپ نے سائنس مضامین کے حق میں کی ہے۔ بہر حال ابھی بھی وقت ہے کہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لیں۔

اویس: اچھی بات ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ مضامین کے انتخاب کے سلسلے میں لاپروائی کا مظاہرہ نہیں کروں گا اور خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گا۔

عامر: بہت خوب! اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرمائے۔ کافی دیر ہو گئی ہے، اب مجھے اجازت دیں۔ ان شاء اللہ پھر ملیں گے۔

(عامر، اویس سے اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

63 ایک بس کنڈکٹر اور مسافر کے درمیان مکالمہ

(ڈیرہ غازی خان 2017ء)

(عامر کسی کام کی غرض سے شہر کی طرف جانے والی لوکل بس میں سوار ہوا تو بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، عامر کنڈکٹر سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

عامر: بھائی! ذرا بات سنیے۔

کنڈکٹر: جی جناب! حکم کریں۔ آپ کی بات نہیں سنیں گے تو اور کس کی سنیں گے۔

عامر: یہ بس کب روانہ ہو گی؟ میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔

کنڈکٹر: آپ صبر کریں! سواریاں تو پوری ہو جائیں۔

عامر: اب کتنا انتظار کراؤ گے؟ بس مسافروں سے بھری پڑی ہے۔

کنڈکٹر: جناب! آپ کی خاطر ہم اپنی سواریاں تو نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ کو پتا ہے کہ ڈیزل مہنگا ہو گیا ہے۔ وہ ہم کیسے پورا کریں۔

عامر: ڈیزل والی بات آپ نے خوب سنائی! پانچ روپے ڈیزل کا نرخ بڑھتا ہے اور کرایہ بیس روپے فی سواری کے حساب سے اضافہ کر دیتے ہیں کچھ خدا کا خوف کرو۔

کنڈکٹر: جناب ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں، جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔

عامر: جب حکومتِ وقت نے ایک معقول کرایہ مقرر کر دیا ہے تو آپ لوگوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔

کنڈکٹر: ہم معقول کرایہ ہی لیتے ہیں۔ کوئی ناجائز نہیں لیتے۔

عامر: خیر میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا، کیوں کہ آپ لوگوں سے بحث کرنا ہی فضول ہے۔ مہربانی کر کے بس اسٹارٹ کراؤ۔

کنڈکٹر: بس جناب! دو تین سواریوں کی گنجائش ہے اور ڈرائیور صاحب بھی آنے والے ہیں تو پھر چلتے ہیں۔

عامر: مجھے دس بجے شہر پہنچنا ہے، لگتا ہے دس تو یہاں کھڑے کھڑے ہی بج جائیں گے۔

کنڈکٹر: اگر اتنی ہی جلدی ہے تو آپ رکشہ ہی کروا لیتے۔

عامر: بڑے افسوس کی بات ہے! آپ کچھ تو مسافروں کا خیال کریں۔

کنڈکٹر: ہم سب کا خیال رکھتے ہیں اور احساس بھی ہے۔ جب بس میں سواریاں مکمل ہو جائیں تو بس بھی چل پڑے گی۔ شاید آپ ہماری بس میں پہلی بار سفر کر رہے ہیں۔

عامر: یہ بات آپ کی درست ہے کہ اس ''لوکل بس'' میں پہلی بار سفر کر رہا ہوں اور آج پتا چل گیا ہے کہ ''لوکل بس'' کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

کنڈکٹر: اچھا جناب! کیا مطلب ہوتا ہے؟ کچھ ہمیں بھی بتائیں۔

عامر: (ہنستے ہوئے) مطلب آسان ہے اور بس کے نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ لوکل، یعنی آج بیٹھو گے تو کل پہنچو گے۔

کنڈکٹر: (ہنستے ہوئے) یہ تو لطیفہ سنا دیا آپ نے، اب اتنا بھی نہیں ہے۔ دس منٹ میں بس چل پڑے گی اور آپ آج ہی پہنچ جائیں گے، بے فکر رہیں۔

عامر: مہربانی ہو گی، وقت بہت قیمتی چیز ہے۔ کوشش کرو بلاوجہ کسی کا وقت ضائع نہ ہو، ہو سکتا ہے کوئی بیمار ہو اور وہ ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہو یا کوئی عدالت میں پیشی کے لیے جا رہا ہو، اب ہر بندہ رکشے کا کرایہ تو ادا نہیں کر سکتا۔

کنڈکٹر: جناب! آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے، لیکن میں ڈرائیور یا بس مالک تو نہیں ہوں۔ میں تو خود ایک معمولی سا کنڈکٹر ہوں۔ مجھے جو ہدایات ملتی ہیں ان پر عمل کرتا ہوں۔

عامر: آپ کنڈکٹر ہیں تو آپ کی بھی ذمہ داری ہے کہ مسافروں سے اچھے انداز میں پیش آئیں۔ جو بزرگ مسافر ہیں ان کا خیال رکھیں، آپ تو مسافروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بس میں ٹھونس رہے ہیں۔ کچھ تو خدا کا خوف کریں۔

کنڈکٹر: اسی غرض سے تو بس اڈے پر لگائی ہے۔ جو مسافر آئے گا ہم نے تو اس کو بس میں سوار کرنا ہے، اگر اب نہیں کریں گے تو ڈرائیور کے پیسے کیسے پورے کریں گے؟

عامر: بس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں اور آپ مزید سواریوں کے انتظار میں ہیں۔

کنڈکٹر: ابھی تو سیٹوں کے درمیان والی جگہ پر بھی سواریاں آسکتی ہیں اور چھت پر بھی جگہ ہے۔

عامر: اُفوہ! اتنا ظلم، گرمی اور گھٹن سے جان نکل رہی ہے اور آپ ہیں کہ چھت بھی بھرنے کے چکر میں ہیں۔

کنڈکٹر: جناب ہم بھی کیا کریں! آپ کو معلوم ہے کہ بہت سے لوگ خود کو طالب علم ظاہر کر کے مفت میں سفر کرتے ہیں اور جو طالب علم نہیں وہ بھی مفت میں سفر کرتے ہیں۔ ہم بھی کہاں جائیں۔ اخراجات تو پورے کرنے ہیں نا۔

عامر: یہ مسئلہ ہے تو آپ لوگ ان کو پکڑ لیں۔

کنڈکٹر: اگر ہم ایسا کریں تو روزانہ لڑائی جھگڑے ہوں گے، فائدہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔

عامر: خیر یہ سب آپ کے مسائل ہیں، آپ ہی بہتر جانتے ہیں، میں تمھارے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا۔

کنڈکٹر: جو حقیقت ہے میں نے آپ کو بتائی ہے۔

عامر: اب مہربانی کرو اور بس اسٹارٹ کراؤ۔

کنڈکٹر: ضرور جناب! اب تو چلنا ہی ہے، وہ دیکھیں ڈرائیور بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا ہے۔

عامر: شکریہ جناب!

(ڈرائیور بس اسٹارٹ کر کے اسے آہستہ آہستہ چلانا شروع کر دیتا ہے۔)

64 دو دوستوں کے درمیان اسلام کو درپیش مسائل پر مکالمہ

(حامد اور اکرم دونوں دوست ہیں، ایک ہی محلّہ میں رہتے ہیں۔ اتوار کا دن ہے، حامد اپنے دوست اکرم سے ملنے آیا ہے، اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

حامد: السلام علیکم! اکرم بھائی کیا حال ہے؟

اکرم: وعلیکم السلام! الحمدللہ، آپ سنائیں حامد بھائی، خیریت ہے؟

حامد: میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن آپ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار کیوں ہیں؟

اکرم: بس بھائی، اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کے حال پر رحم فرمائے۔

حامد: بھائی صاحب! کچھ بتاؤ گے بھی کہ یوں ہی ٹال مٹول سے کام لیتے رہو گے۔

اکرم: بات یہ ہے کہ کچھ بیرونی قوتیں اس سازش میں ملوث ہیں کہ اسلام کو کمزور کیا جائے اور مسلمانوں کو آپس میں لڑایا جائے۔

حامد: اگر ہم نے اسلام کی حفاظت کرنی ہے اور جو مسائل اسلام کو درپیش ہیں، اگر ان کا خاتمہ کرنا ہے تو ہم سب کو اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ہوگا۔

اکرم: یہی تو المیہ ہے کہ بیرونی طاقتیں اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کر رہی ہیں اور ہمیں اس بات کا احساس تک نہیں ہے۔

حامد: بس بھائی! آج پورا کفر عالمِ اسلام کے خلاف ''الکفر ملۃ واحدۃ'' کی مثال بن کر مسلمانوں کو مٹانے کی غرض سے اکٹھا ہو چکا ہے۔

اکرم: آپ کی بات درست ہے، پوری دنیا میں مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھایا جا رہا ہے، فلسطین، عراق، کشمیر، افغانستان ہر جگہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ یہ ظلم و ستم کا سلسلہ پتا نہیں کب رکے گا؟

حامد: ظلم سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اتنے طاقت ور ہو جائیں کہ کفریہ طاقتوں کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے، جب ہم اپنے اندر اتفاق و اتحاد پیدا کریں گے۔

اکرم: عجیب بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس مادی وسائل بھی زیادہ ہیں اور پھر بھی یہ ظلم کی چکی میں پستے جا رہے ہیں۔

حامد: لیکن ان وسائل کا صحیح استعمال بھی تو ہونا چاہیے، اب حالت یہ ہے کہ ان سب وسائل پر امریکہ کا قبضہ ہے۔

اکرم: اگر ہم اپنی صفوں میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں جیسا اتحاد پیدا کریں اور باہمی اختلافات کو بھلا کر متحد ہو جائیں تو پستی کی گہرائیوں سے نکل کر ترقی کی بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

حامد: یہ بات تو آپ کی درست ہے، ہماری کامیابی غیروں کی نقالی میں نہیں بلکہ آپ ﷺ کی اطاعت میں ہے۔

اکرم: قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان مبارک ہے کہ:

''اور تم سب اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو'' (سورۃ آلِ عمران: 103)

حامد: عالمِ اسلام کو درپیش مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ پورا عالمِ کفر مسلمانوں کو مٹانے کی غرض سے اکٹھا ہو چکا اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو ختم کر رہا ہے، تاکہ وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔

اکرم: اس معاملے میں علما کرام کا فرض ہے کہ وہ افہام و تفہیم سے انتشار کے مسائل کا حل نکالیں اور عوام میں فرقہ واریت کو فروغ دینے کی بجائے، اتفاق و اتحاد کا درس دیں۔

حامد: دراصل فرقہ واریت ایک زہر ہے جو تیزی سے مسلمانوں میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔

اکرم: آپ کے خیال میں اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

حامد: موجودہ حالات دیکھ کر تو یہی کہا جا سکتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر — اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اکرم: آپ کی بات درست ہے۔ اسلام کو درپیش مسائل میں سے ایک سنجیدہ مسئلہ عالمِ اسلام کے نااہل اور دینِ اسلام سے بے زار حکمران بھی ہیں۔ اگر قیادت ٹھیک ہو جائے تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

حامد: آپ نے بجا فرمایا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے زوال کی بڑی وجہ قرآن پاک کی تعلیمات سے انحراف ہے۔

اکرم: بے شک! جب ہم قرآن کی آفاقی تعلیمات پر عمل کرنے کی بجائے آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں تو بیرونی قوتوں کو بھی موقع مل جاتا ہے۔

حامد: اب ہمیں بھی ہوش میں آ جانا چاہیے اور یہ بہت ضروری ہے کہ مسلم ممالک کے سربراہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کریں اور آپس میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں اور اپنی معیشت کو بھی مضبوط کریں۔

اکرم: جی ہاں! اور قیادت بھی قوم کے ہمدرد اور نیک لوگوں کے پاس ہونی چاہیے۔

حامد: اگر ایسا ہو جائے تو سارے مسئلے ہی حل ہو جائیں گے اور اسلام اور مسلمانوں کی طرف کوئی میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے گا۔

اکرم: ان شاء اللہ۔ ایسا ہی ہوگا اور سارے مسئلے حل ہو کر رہیں گے اور اسلام غالب آ کر رہے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان مبارک ہے: **''وہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ اسے اور تمام مذاہب پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکین ناخوش ہوں''۔ (سورۃ صف: 8)**

حامد: ان شاء اللہ! ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہیں کہ ''اے اللہ! ہمیں فتنہ و فساد سے بچا اور ہم مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق نصیب فرما اور دینِ اسلام کی حفاظت فرما۔

اکرم: آمین!

حامد: اکرم بھائی! مجھے اجازت دیں۔ کچھ ضروری چیزیں خریدنے کے لیے بازار جانا ہے۔ اللہ حافظ۔

اکرم: اللہ حافظ۔

(حامد، اکرم سے اجازت لے کر بازار کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

65 دو طالب علموں کے درمیان ''میڈیکل انٹری ٹیسٹ'' کے موضوع پر مکالمہ

(عارف ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے، چند لمحوں بعد اس کا دوست طارق آتا ہے اور ہم کلام ہوتا ہے۔)

طارق: السلام علیکم!

عارف: وعلیکم السلام!

طارق: خیریت تو ہے بھئی۔ پریشان کیوں بیٹھے ہو؟

عارف: بس بھئی۔ خیریت ہی سمجھو۔

طارق: کچھ تو بتاؤ بھئی، یہ حالات کا خاموش شکوہ کیوں ہے؟

عارف: تمھیں تو معلوم ہے کہ میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں، میں ابھی انٹری ٹیسٹ دے کر آیا ہوں۔

طارق: تو پھر اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟

عارف: بس یار۔ انٹری ٹیسٹ سسٹم کو دیکھ کر حیران و پریشان ہوتا ہوں۔

طارق: کیوں بھئی! انٹری ٹیسٹ کے نظام نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟

عارف: میرا کیا بگاڑنا تھا بلکہ پوری قوم ہی اس نظام سے پریشان ہے۔

میں اپنا رونا نہیں روتا، سارے چمن کا ہوں مرثیہ خواں — محلوں کے محل اُکھاڑ ڈالے طوفان نے، مرا تو تھا فقط کچا آشیاں

طارق: یار تم صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟

عارف: دیکھو بھئی! اس سسٹم میں ایک طرف تو کامیاب ہو کر ڈاکٹر بننے کا خواب پورا ہوتا ہے، جب کہ دوسری طرف ناکامی کا خوف۔

طارق: مجھے تو یہ لگتا ہے کہ یہ میڈیکل انٹری ٹیسٹ کم اور نفسیاتی ٹیسٹ زیادہ ہے۔

عارف: ہاں یار! بعض اوقات تو بورڈ میں نمایاں پوزیشن لینے والے بھی اس ٹیسٹ میں فیل ہو جاتے ہیں۔ بھلا یہ کیسا انصاف ہے کہ دو سالوں کی مشقت بھری محنت کا جائزہ محض تین گھنٹوں میں لیا جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی طالب علم کو کوئی پریشانی لاحق ہو یا طبیعت خراب ہو یا کوئی حادثہ پیش آجائے تو اس کا مستقبل داؤ پر لگ جاتا ہے۔

طارق: حالاں کہ ہمارے ہاں بورڈ کا امتحان بھی معیاری ہوتا ہے اور اب تو امتحانی نظام کو جدید بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔

عارف: لیکن بعض طالب علم رٹا لگا کر اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

طارق: اکثر و بیشتر تو ''بوٹی مافیا'' کا سہارا لیتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

عارف: اسی لیے تو انٹری ٹیسٹ سسٹم لازمی قرار دیا گیا ہے۔

طارق: تم ٹھیک کہتے ہو کیوں کہ یہ نظام متعدد ممالک میں کئی سالوں سے رائج ہے۔

عارف: لیکن اس سسٹم میں ایک خرابی یہ بھی تو ہے کہ زیادہ تر سوالات ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا جواب ہاں یا نہ میں دینا پڑتا ہے۔

طارق: اس سے ہمارے ذہن میں آر یا پار کا لفظ بھی تو گردش کرتا ہے۔

عارف: یہ تو سچ ہے کہ جواب ہاں یا نہ میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہیں اور آپ نے محنت بھی خوب کی ہے تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا — وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا

طارق: ہاں بھئی! تمھاری بات بالکل درست ہے، کیوں کہ بقول ایک دانا کے: ''ہمیشہ محنت کی چابی سے ہی کامیابی کا تالا کھلتا ہے۔''

عارف: اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ میں بھی پُر اُمید ہوں لیکن دل میں خوف ہے کہ کہیں میرٹ بہت زیادہ نہ ہو جائے۔

طارق: میں تمھارے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اس امتحان میں کامیابی عطا فرمائے تاکہ تم ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی بھرپور طریقے سے خدمت کر سکو۔

عارف: آمین۔ اللہ تعالیٰ تمھاری زبان مبارک کرے۔

طارق: اچھا عارف بھائی! مجھے گھر پر ایک ضروری کام ہے۔ مجھے اجازت دیں۔

عارف: بہت شکریہ طارق۔

(طارق، عارف سے اجازت لے کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

66 کالج کی فیس بڑھائی جانے کے موضوع پر دو دوستوں کے درمیان مکالمہ

(عمران اور عاطف دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔ عاطف لائبریری میں اخبار کے مطالعہ میں مصروف ہے، عاطف اس کے پاس آتا ہے اور ہم کلام ہوتا ہے۔)

عمران: السلام علیکم!

عاطف: وعلیکم السلام! آؤ عمران بھائی، کیسے ہو؟

عمران: الحمدللہ، ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں، آج آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں، کیا بات ہے؟

عاطف: یار آپ کو تو پتا ہے کہ کالج کی فیس میں اضافے کی نوید سنائی گئی ہے۔

عمران: ہاں یار! یہ تو واقعی ظلم ہے اور انتظامیہ نے کم و بیش پچیس فیصد اضافہ کیا ہے۔

عاطف: ایک تو ویسے ہی ملک میں مہنگائی عروج پر ہے اور اوپر سے یہ کسر رہتی تھی جو پوری ہو گئی۔

عمران: مہنگائی نے تو ہم غریبوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ اشیائے خورونوش پر بھی سیلز ٹیکس لگا دیا گیا ہے، اور جس کی وجہ سے روزمرہ استعمال کی چیزیں بہت مہنگی ہو گئی ہیں۔

عاطف: حالاں کہ حکومت کو چاہیے کہ مہنگائی کے سدِباب کی کوشش کرے، کیوں کہ اس مہنگائی کی وجہ سے خوش حال زندگی ناممکن بن گئی ہے۔

عمران: حکومت کو عوام کے مسائل کی کیا فکر ہو سکتی ہے اور ایسے وقت میں جب مہنگائی عروج پر ہے، کالج انتظامیہ نے فیس بڑھا کر زیادتی کی ہے۔

عاطف: ہاں یار! ظلم تو ہے لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں اس معاملے میں۔

عمران: آپ پرنسپل صاحب سے ملیں پتا چلے کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

عاطف: یار! میں کل پرنسپل صاحب سے بھی ملا تھا اور اس سلسلے میں ان سے بھی بات ہوئی تھی۔

عمران: تو انھوں نے فیس بڑھائے جانے کی کیا وجہ بتائی؟

عاطف: انھوں نے بتایا ہے کہ انتظامیہ نے جو فیصلہ کیا ہے سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے اور ان کا فیصلہ حتمی ہے۔

عمران: لیکن اس اچانک فیصلے سے کالج کی نیک نامی پر برا اثر پڑے گا۔

عاطف: اثر پڑے گا نہیں بلکہ پڑ چکا ہے اور بہت سے طالب علم کالج چھوڑنے کا فیصلہ بھی کر چکے ہیں۔

عمران: اس طرح تو فائدہ ہونے کی بجائے کالج انتظامیہ کو نقصان ہو گا۔

عاطف: وہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔ ابھی تو جو فیصلہ ہو گیا بس ہو گیا۔

عمران: آپ کی بات درست ہے۔ جو طالب علم غریب ہیں، ان کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا۔

عاطف: اسی لیے تو میں پریشان ہوں۔ پہلے ہی بہت مشکل سے فیس ادا کرتے تھے اب اور زیادہ مشکل ہو جائے گی۔

عمران: اس مہنگائی نے تو ہم غریبوں کی زندگی مشکلات کا شکار کر دی ہے۔ اور بے چارے عوام کی اکثریت غربت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

عاطف: میں تو ہر وقت پریشان رہتا ہوں پتا نہیں یہ مہنگائی کا سیلاب ہمیں کہاں پہنچا کر دم لے گا۔

عمران: ہر شخص حصولِ زر کی دوڑ میں سرگرداں ہے اور راتوں رات امیر بننا چاہتا ہے، جس کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل جنم لے رہے ہیں۔

عاطف: کالج انتظامیہ بھی شاید راتوں رات امیر بننا چاہتی ہے، اسی لیے تو انھوں نے فیس میں اضافہ کر دیا ہے۔

عمران: آپ کے خیال میں یہ اضافہ پرنسپل صاحب نے کیا ہے؟

عاطف: نہیں بھائی! یہ ان کا اکیلے کا کام نہیں ہے، اس ظلم میں مالکان بھی شامل ہیں۔

عمران: لیکن اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی۔

عاطف: وہ کہتے ہیں کہ کالج کے دیگر اخراجات کے علاوہ اساتذہ کو بھاری تنخواہیں دینا پڑتی ہیں۔

عمران: یہ تو ان کے اپنے مسائل ہیں۔ فیس میں اضافہ کرنا ہی ہے تو ایک جائز اضافہ ہو جو قابلِ برداشت بھی ہو۔

عاطف: اگر پانچ یا چھے سو روپے ہوتا تو قابلِ برداشت تھا۔ یہ تو پندرہ سو روپے اضافہ کر دیا گیا ہے۔

عمران: بس یار! ہم تو یہی دعا کر سکتے ہیں کہ کالج انتظامیہ ہم غریبوں کے مسائل کو سمجھتے ہوئے فیس میں اضافہ کرنے کے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرے۔

عاطف: ہاں بھائی۔ ضرور نظر ثانی کرنی چاہیے، ورنہ ہمارے لیے تعلیم جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

عمران: اچھا عمران بھائی مجھے اجازت دیں۔ اردو کا لیکچر شروع ہوا چاہتا ہے۔

(عمران، عاطف سے اجازت لے کر اپنی جماعت کے کمرے کی طرف چل پڑتا ہے۔)

67 دو سہیلیوں میں شہری اور دیہاتی زندگی پر مکالمہ

(سعدیہ اور بشریٰ دونوں سہیلیاں ہیں۔ بشریٰ کالج کی لائبریری میں بیٹھی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے۔ سعدیہ اس کے پاس آتی ہے اور ہم کلام ہوتی ہے۔)

سعدیہ: السلام علیکم!

بشریٰ: وعلیکم السلام!

سعدیہ: کیا بات ہے؟ کون سی کتاب کا مطالعہ کر رہی ہو؟

بشریٰ: کل کالج میں ''دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ'' کے عنوان پر مضمون نویسی کا مقابلہ ہے۔ اس کے لیے تیاری کر رہی ہوں۔

سعدیہ: بہت خوب ویسے دیہاتوں اور شہروں کے ماحول، طرز زندگی اور معاشرت میں خاصا فرق ہوتا ہے۔

بشریٰ: بات یہ ہے کہ شہر ہوں یا دیہات، دونوں کے ملنے سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ ملک کا وہ حصہ جو مادی وسائل سے مالا مال ہو، ترقی یافتہ ہو، شہر کہلاتا ہے اور وہ حصہ جو قدرتی اور فطری حسن سے مالا مال ہو، دیہات کہلاتا ہے۔

سعدیہ: تو آپ کے خیال میں دیہاتی زندگی بہتر ہے یا شہری زندگی؟

بشریٰ: بعض وجوہات کی بنا پر دیہاتی زندگی شہر سے بدرجہ بہتر معلوم ہوتی ہے اور کئی اعتبار سے شہری زندگی مفید معلوم ہوتی ہے لہٰذا ہم پوری فیصد دعوے سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ دیہات کی زندگی اچھی ہے یا شہر کی زندگی بہتر ہے۔

سعدیہ: آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے، لیکن آج کل تو لوگ دیہاتوں سے نقل مکانی کر کے شہروں کا رخ کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے شہری آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

بشریٰ: اس وقت بھی پاکستان کی آبادی کا ستر فیصد حصہ دیہاتوں میں، جب کہ تیس فیصد حصہ شہروں میں آباد ہے۔

سعدیہ: دراصل دیہات کا ماحول صاف ستھرا اور صحت مند ہوتا ہے اور شہر کی نسبت دیہات کی آب و ہوا صاف اور شفاف ہوتی ہے۔ یہ سب قدرت کے وہ انعامات ہیں، جو شہر والوں کو نصیب نہیں ہوتے لہٰذا دیہات کی زندگی اچھی ہوتی ہے۔

بشریٰ: شہر ہوں یا دیہات، دونوں کے کچھ روشن پہلو ہوتے ہیں اور کچھ تاریک۔ دیہات میں پرسکون ماحول ہوتا ہے شہر کی طرح ہر وقت گاڑیوں کا شور، تیز ہارن اور ہنگامہ پرور زندگی نہیں ہوتی۔

سعدیہ: جی ہاں! یہ پرسکون ماحول ہمارے نصیب میں کہاں؟

بشریٰ: اس کے علاوہ دیہاتوں میں دودھ، مکھن، گھی اور دہی وغیرہ خالص ملتے ہیں، وہاں کے رہنے والوں کی صحت بھی قابل رشک ہوتی ہے اور دیہات کے لوگ محنت کر کے غلہ اگاتے ہیں، جس سے ملک کی غذائی ضرورت پوری ہوتی ہے۔

سعدیہ: شہر میں تو دودھ میں بھی پانی کی ملاوٹ ہوتی ہے، اچھی اور خالص غذائیں ملتی ہی نہیں۔

بشریٰ: لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے اگر ہم دوسرے رخ سے دیکھیں تو شہر کے بہت سے روشن پہلو بھی نظر آئیں گے۔

سعدیہ: جی بالکل! آپ کی بات سو فیصد درست ہے۔ شہروں میں ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں۔ روزمرہ کی تمام چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

بشریٰ: شہری زندگی کی اپنی خصوصیات ہیں اور کئی اعتبار سے دیہاتی زندگی سے اچھی ہے مثلاً بیماری یا حادثے کی صورت میں فوراً طبی امداد مل جاتی ہے، جب کہ دیہات میں طبی سہولتوں کی کمی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں تعلیمی سہولتیں بھی عام ہیں۔

سعدیہ: تو کیا دیہات میں اسکول نہیں ہوتے؟

بشریٰ: دیہات میں تعلیم کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں، جب کہ شہر میں تعلیم کے حصول کے لیے کسی بھی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بہت سے اسکول، کالج اور یونی ورسٹیاں ہوتی ہیں اور پبلک لائبریریاں بھی ہوتی ہیں۔

سعدیہ: درحقیقت شہر میں رہنے والوں کے لیے تعلیمی ادارے اور تعلیمی سہولیات بہت بڑی نعمت ہیں۔

بشریٰ: بالکل! دیہات کے لوگ نقل مکانی کر کے شہر میں، اس لیے بھی آتے ہیں کہ شہر میں روزگار کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں، ہزاروں لوگ کارخانوں، فیکٹریوں اور ملوں میں ملازمت کرتے ہیں۔ جب کہ دیہات میں بے روزگاری عام ہوتی ہے۔

سعدیہ: لیکن ایک بات یاد رکھو۔ ملک کی خوش حالی میں دیہاتی لوگ اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ کسان ہمارے ملک کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، انھی کی وجہ سے کارخانے اور فیکٹریاں چل رہی ہیں۔

بشریٰ: اس بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ دیہاتی لوگ دن رات محنت کر کے ملک کو خوش حال بنا رہے ہیں مثلاً گنا کاشت کر کے شوگر ملوں میں پہنچاتے ہیں، جس سے ملک میں چینی کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔

سعدیہ: اس کا مطلب ہے، بقول مولانا حالی:

وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا — کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا

بشریٰ: لیکن دورِ جدید کی تمام سہولتیں اور آسائشیں شہریوں کو میسر ہوتی ہیں اور دیہات کے لوگ ان سہولتوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

سعدیہ: ہاں یہ بات ٹھیک ہے لیکن شہر کے لوگ جب شہری زندگی سے اکتا جاتے ہیں تو سکون کی تلاش میں دیہاتوں کا رخ کرتے ہیں۔

بشریٰ: وہ اس لیے کہ شہروں میں دیہات کی طرح پرسکون ماحول نہیں ملتا۔ ٹریفک کا شور اور گاڑیوں کا دھواں، شہری زندگی کا سکون درہم برہم کرنے کے ساتھ ساتھ صحت کا بھی ستیاناس کر دیتا ہے۔

سعدیہ: یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں لیکن شہر کے لوگ جدید ایجادات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ترقی کی دوڑ میں شامل ہیں اور دیہات کے رہنے والے ان سہولیات سے محروم ہیں۔

بشریٰ: یہ بات درست ہے کہ آمد و رفت کے لیے شہر میں پختہ سڑکیں ہیں، روپے پیسے کے تحفظ کے لیے بینک ہیں، تفریح کے لیے پارک ہیں۔ کاروبار اور سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کے مواقع ہیں اور یہ سب سہولیات ہیں، جو کہ دیہات کے رہنے والوں کو میسر نہیں ہیں۔

سعدیہ: جی بالکل، دیہاتوں میں پختہ سڑکیں اور کارخانے وغیرہ بھی نہیں ہوتے۔ جس کی وجہ سے دیہات میں رہنے والے بے روزگاری کا شکار رہتے ہیں۔

بشریٰ: یہی وجہ ہے کہ دیہات میں رہنے والے شہروں کا رخ کرتے ہیں اور وہاں وہ اپنے عزیز و اقارب اور گھر والوں سے دور تنگ و تاریک کرائے کے مکانوں میں رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

سعدیہ: حکومت کو چاہیے کہ وہ دیہاتوں میں پختہ سڑکیں تعمیر کرے، کارخانے اور فیکٹریاں لگائے تاکہ دیہات کے رہنے والے ان میں ملازمت کر کے اپنے ہی علاقوں میں خوش حال زندگی بسر کر سکیں۔

بشریٰ: جی بالکل، آپ کی بات ٹھیک ہے۔ اللہ کرے ہماری حکومت کو بھی اس بات کا احساس ہو جائے۔

سعدیہ: اچھا بشریٰ، میں چلتی ہوں۔ اُردو کا لیکچر شروع ہونے والا ہے۔

بشریٰ: شکریہ سعدیہ آپ سے بڑی مفید گفتگو ہوئی ہے، جس سے مضمون لکھنے میں معاونت ہوگی۔ میں اب مضمون مکمل کر لیتی ہوں۔ ان شاء اللہ بہت جلد ملاقات ہوگی۔

(سعدیہ، بشریٰ سے اجازت لے کر اپنی جماعت کے کمرے کی طرف چل پڑتی ہے۔)

68 پاکستان میں ڈیموں کی ضرورت اور اہمیت کے موضوع پر دو دوستوں کے درمیان مکالمہ

(شام کا وقت ہے ریاض نہر کے کنارے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا دوست آصف آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

آصف: السلام علیکم!

ریاض: وعلیکم السلام!

آصف: خیریت تو ہے، پریشان کیوں ہو؟

ریاض: بس یار! خیریت ہی سمجھو۔

آصف: کیا ہوا؟

ریاض: کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس نہر میں پانی کیوں نہیں ہے؟

آصف: مجھے معلوم نہیں، آپ بتا دیں۔

ریاض: افوہ میرے خدایا! کیا تمھارے علم میں نہیں ہے کہ ہم خشک سالی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔

آصف: وہ کیسے؟

ریاض: لگتا ہے کہ تم نے اقوام متحدہ کے ایک اہم ادارے یونیسیف کی رپورٹ نہیں پڑھی۔ اگر یہی حال رہا تو 2025ء تک ہمارے ملک کی قابل کاشت زمینیں خشک اور بنجر ہو جائیں گی۔

آصف: (پریشان ہو کر) تو پھر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

ریاض: ہمیں چاہیے کہ ہم مزید ڈیم بنائیں تاکہ خشک سالی جیسے خطرناک مسئلے سے نجات حاصل کر سکیں۔ اگر ہم اپنے ہمسایہ ممالک کا جائزہ لیں تو ان کے پاس ہم سے زیادہ ڈیم ہیں۔

آصف: واقعی ڈیم کی عدم دستیابی ہمارے لیے موت کا سبب بن سکتی ہے۔

ریاض: جی ہاں بالکل، درحقیقت پانی تو زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں کہ ''ہم نے پانی سے ہر شے کو زندہ کیا۔''

آصف: تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن ڈیم بنانے کے اور کیا فوائد ہیں؟

ریاض: ڈیم کی بدولت ہم پانی کو ضائع ہونے سے بچا سکتے ہیں اور اس پانی کو ضرورت کے وقت فصلوں، پودوں، جانوروں اور زمینوں وغیرہ کو سیراب کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

آصف: ان ڈیموں سے سستی بجلی بھی تو پیدا کی جا سکتی ہے۔

ریاض: جی ہاں! کیوں کہ ڈیموں کی کمی کی وجہ سے ہمارے ملک میں زیادہ تر بجلی، تیل اور گیس وغیرہ سے پیدا کی جاتی ہے، جو کافی مہنگی پڑتی ہے۔

آصف: ہماری سابقہ حکومتوں نے ڈیم بنانے کے لیے کوئی منصوبہ بندی کی؟

ریاض: کسی بھی حکومت نے ڈیم بنانے کی طرف توجہ نہیں دی۔

آصف: شاید یہی وجہ ہے کہ ہم پانی کی کمی کا شکار ہیں۔ اگر موجودہ حکومت نے بھی توجہ نہ دی تو ہم تباہی کا شکار ہو جائیں گے۔

ریاض: جی بالکل درست کہا تم نے، ہمارے سیاست دان ہمیشہ آپس میں دست و گریبان رہے، لیکن ڈیم بنانے کی طرف بالکل توجہ نہ دی۔

لٹ رہا ہے کارواں پاسباں کہاں گئے　　کون ہے جو فغاں رازداں کہاں گئے

آصف: ہمارے بڑے شہروں میں بھی عوام کو پانی کی شدید قلت کا سامنا ہے۔

ریاض: جی ہاں، خاص طور پر کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں یہ مسئلہ خطرناک حد تک پہنچ چکا ہے۔ اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ڈیم بنائیں۔

آصف: کیا ہمیں ''ڈیم بناؤ، ملک بچاؤ'' جیسی سوشل میڈیا کی مہم کا حصہ بننا چاہیے؟

ریاض: ضرور حصہ لینا چاہیے اور اس سلسلے میں ہمیں فنڈز بھی دینے چاہییں، تاکہ ہمارا ملک جلد از جلد اس خطرناک مسئلے سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔

آصف: شکریہ ریاض بھائی۔ آپ نے بہت مفید معلومات فراہم کیں اور ایک اہم مسئلہ کی جانب میری توجہ مبذول کرائی۔ ان شاء اللہ میں آج ہی ''چیف جسٹس ڈیم فنڈ'' میں اپنا حصہ ڈالوں گا۔

ریاض: بہت خوب، اگر ہمارے ملک کے ہر شہری کی سوچ آپ جیسی ہو جائے تو ہم بہت جلد ڈیم بنانے کے قابل ہو جائیں گے۔

آصف: بہت شکریہ ریاض بھائی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو تمام مسائل و مشکلات سے محفوظ فرمائے۔

ریاض: آمین

آصف: ریاض بھائی، مجھے اجازت دیں۔ گھر پر ضروری کام ہے۔

ریاض: آصف بھائی، میں بھی گھر چلتا ہوں۔

(دونوں دوست اپنے اپنے گھر کی طرف چل دیتے ہیں۔)

69 دو دوستوں کے درمیان شہر کی بڑھتی ہوئی آلودگی کے موضوع پر مکالمہ

(اسلم اور اکرم دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔ اتوار کے دن اسلم پارک میں بیٹھا ہے۔ اکرم اس کے پاس آتا ہے اور دونوں میں گفتگو کا آغاز یوں ہوتا ہے۔)

اکرم: السلام علیکم!

اسلم: (کھانستے ہوئے) وعلیکم السلام! آؤ بھئی اکرم! کیسے ہو؟

اکرم: میں تو بالکل ٹھیک ہوں! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، آپ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔

اسلم: بس یار! کچھ مت پوچھو، آج دوسرا دن ہے، بہت کھانسی ہو رہی ہے۔

اکرم: اوہو! بہت پریشانی ہوئی سن کر، آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے دوائی لیں۔

اسلم: ہاں یار: سر چکرا رہا ہے اور شہر کی ماحولیاتی آلودگی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔

اکرم: آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے! گاڑیوں کا زہریلا دھواں تو ہمارے ماحول کو اتنا زہریلا کر رہا ہے کہ سانس لینا بھی دشوار ہے۔

اسلم: (زور سے کھانستے ہو) آج کل فضائی آلودگی بہت بڑا مسئلہ ہے اور بہت سی مہلک بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔ ان گاڑیوں کے زہریلے دھویں کا کوئی حل نہیں ہے کیا؟

اکرم: یہی تو ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمارے ملک میں اس کا سدِ باب نہیں کیا جاتا، ورنہ دوسرے ممالک میں تو دھواں چھوڑنے والی گاڑیاں ضبط کر لی جاتی ہیں اور گاڑیوں کے ڈرائیوروں کے لائسنس بھی منسوخ کر دیے جاتے ہیں۔

اسلم: ہاں یار! اگر ایسا ہمارے ہاں بھی ہو جائے تو کوئی پریشانی ہی نہ رہے۔

اکرم: اصل بات یہ ہے کی لوگ اس چیز کا احساس نہیں کرتے کہ ان کی معمولی بے پروائی سے دوسروں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ انسان تو انسان، جانور بھی پریشان ہیں۔

اسلم: جانور کیسے پریشان ہیں؟

اکرم: آلودگی کا سبب صرف گاڑیوں کا دھواں ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی اسباب ہیں مثلاً کارخانوں سے جو زہریلا مواد خارج ہوتا ہے وہ ندی نالوں میں پھینک دیا جاتا ہے جس سے مچھلیوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

اسلم: یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔

اکرم: جی ہاں! ظلم تو ہے! اکثر مچھلیاں تو مر جاتی ہیں اور جو بچ جاتی ہیں وہ بیمار ہو جاتی ہیں، ان کے کھانے سے انسان بھی مہلک بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسلم: کیا واقعی؟ اس سے تو گاؤں والے ہم سے بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں، کم از کم مختلف قسم کی آلودگی سے محفوظ ہیں۔

اکرم: (ہنستے ہوئے) تم صحیح کہتے ہو۔ گاؤں کی آب و ہوا بہت بڑی نعمت ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہاں کا ماحول بڑا پرسکون ہوتا ہے۔

اسلم: ہاں یار: آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں یہاں تو فضائی آلودگی کے ساتھ شور شرابہ اتنا ہوتا ہے کہ سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ زور زور سے ہارن کی آواز آتی ہے۔ جس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

اکرم: یہ سب خرافات فضائی آلودگی کا حصہ ہیں، بلند آواز سے جب ہارن بجتا ہے تو ساتھ گزرنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے۔

اسلم: ان لوگوں کی معمولی سی لاپروائی، دوسرے انسانوں کے لیے کتنی تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔

اکرم: اس کے علاوہ فیکٹری اور کارخانوں کا دھواں، اینٹیں پکانے والے بھٹے، جن میں آج کل ہر قسم کا کچرا ڈال کر آگ جلائی جاتی ہے، بھی فضائی آلودگی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

اسلم: جی بالکل! اور دن کے وقت تو آلودگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ہر دوسرا شہری کھانسی کا مریض بن جاتا ہے۔

اکرم: اور یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر اور حکیموں کے پاس ایسے مریضوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے۔

اسلم: اس کے علاوہ اور کیا چیز آلودگی کا سبب بنتی ہے؟

اکرم: دراصل! آلودگی پھیلانے میں ہم بھی شامل ہیں۔ ہم اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ باہر پھینک دیتے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء کو ڈھا
نپ کر نہیں رکھتے۔ جس سے مختلف بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ ڈینگی مچھر اس کی وجہ سے ہی پرورش پاتا ہے۔

اسلم: اسی وجہ سے ڈینگی بخار ایک وبا کی طرح پھیل رہا ہے۔ اس سے بچاؤ کیسے ہو سکتا ہے؟

اکرم: صفائی کا خیال رکھیں۔ آلودگی کو ختم کریں، گھر میں اور گھر سے باہر پانی جمع نہیں ہونا چاہیے۔ ہسپتالوں میں بھی صفائی کا بہتر
انتظام ہونا چاہیے۔

اسلم: حکومت کو چاہیے کہ آلودگی ختم کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔

اکرم: حکومت آلودگی کو ختم کرنے اور آلودگی کی روک تھام کے لیے اقدامات کر رہی ہے لیکن عوام کو بھی شعور اور آگاہی حاصل ہونی چاہیے۔

اسلم: ہاں یار! اگر لوگوں کو شعور اور آگاہی ہو جائے تو وہ آلودگی سے بچ سکتے ہیں۔

اکرم: پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے عوام میں شعور بیدار کیا جا سکتا ہے۔

اسلم: اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ دے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

اکرم: آمین۔

اسلم: آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے مجھے مفید معلومات دیں۔ اب میں چلتا ہوں۔

اکرم: اللہ تعالیٰ آپ کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے میری باتیں پوری توجہ اور دھیان سے سنی ہیں۔

(اسلم، اکرم سے اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے)

70 ہوٹل کے منیجر اور مسافر کے درمیان مکالمہ

(فیصل آباد بورڈ، بہاول پور بورڈ 14، فیصل آباد ملتان 15)

(شہر کے ایک خوب صورت، صاف ستھرے ہوٹل میں شاہد صاحب داخل ہوتے ہیں۔ ہوٹل کا منیجر انھیں خوش آمدید کہتا ہے، دونوں میں گفتگو کا آغاز یوں ہوتا ہے۔)

شاہد صاحب: السلام علیکم! جناب

منیجر: وعلیکم السلام! جی فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

شاہد صاحب: مجھے ایک کمرا چاہیے۔

منیجر: آپ کتنے دن کے لیے قیام فرمائیں گے؟

شاہد صاحب: تقریباً تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔

منیجر: ٹھیک ہے جناب! کمرا نمبر ایک سو دس (۱۱۰) آپ کو مل جائے گا۔

شاہد صاحب: کمرا نمبر ایک سو دس تو دوسری منزل پر ہوگا؟

منیجر: جی ہاں جناب! آج کل مہمانوں کی آمد زیادہ ہے، اس وجہ سے پہلی منزل پر کوئی کمرا خالی نہیں ہے۔

شاہد صاحب: کوئی بات نہیں! کمرا صاف ستھرا ہونا چاہیے۔

منیجر: آپ بے فکر رہیں جناب! ہمارے ہوٹل کا معیار آپ کو پسند آئے گا اور ہماری خدمات سے آپ خوش ہو جائیں گے۔

شاہد صاحب: اچھی بات ہے! ویسے میں نے آپ کے ہوٹل کی تعریف سن رکھی ہے۔

منیجر: تعریف کا شکریہ جناب! آپ یہاں سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں یا کسی کام کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟

شاہد صاحب: میں دراصل ایک میڈیسن کمپنی میں ملازم ہوں اور کمپنی کی طرف سے ہی کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔

منیجر: یعنی سفر کے اخراجات اور رہائش وغیرہ کا خرچ کمپنی کی طرف سے آپ کو ملتا ہوگا۔

شاہد صاحب: جی ہاں! یہاں تین دن کے قیام کی سہولت مجھے کمپنی کی طرف سے دی گئی ہے۔

منیجر: یہ سن کر خوشی ہوئی۔ ہمارے ہوٹل کے انتخاب پر ایک بار پھر آپ کا شکریہ۔

شاہد صاحب: مجھے آپ سے گفتگو کر کے خوشی ہوئی ہے۔

منیجر: یہ لیں جناب کمرا نمبر ۱۱۰ کی چابی اور کھانے میں آپ کیا پسند کریں گے؟

شاہد صاحب: ایک پلیٹ بریانی، شامی کباب، دہی اور سلاد وغیرہ بھجوا دیجیے۔

منیجر: ٹھیک ہے جناب! آپ بیرے کے ساتھ چلیں تھوڑی دیر میں کھانا آپ کے کمرے میں بھجوا دیتے ہیں۔

بیرا: آیئے جناب! میں آپ کو کمرا دکھا دوں۔

شاہد صاحب: ٹھیک ہے! چلیں (شاہد صاحب بیرے کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔)

بیرا: یہ ہے جناب کمرا نمبر ۱۱۰، صاف ستھرا ہوادار کمرا ہے، یہ کھڑکی روڈ کی طرف کھلتی ہے۔

شاہد صاحب: کمرا تو واقعی اچھا اور صاف ستھرا ہے۔

بیرا: ہمارے ہوٹل کا ہر کمرا اسی طرح صاف ستھرا ہے۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبائیں گے تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔

شاہد صاحب: فی الحال تو جلدی سے بریانی لے آئیں بہت بھوک لگی ہے۔

بیرا: میں ابھی لے کر آتا ہوں جناب (تھوڑی دیر میں بیرا بریانی لے آتا ہے۔)

شاہد صاحب: بہت خوب! بریانی کا ذائقہ تو بہت اچھا ہے۔

بیرا: شکریہ جناب! میرے لیے کوئی اور حکم ہو تو فرمایئے؟

شاہد صاحب: بل لے آؤ اور یہ برتن بھی لیتے جانا۔

بیرا: (چند لمحوں کے بعد بیرا بل لے آتا ہے) یہ لیجیے جناب! دو سو تیس روپے کا بل ہے۔

شاہد صاحب: یہ لو! اڑھائی سو روپے بقایا بیس روپے تم رکھ لینا۔

بیرا: بہت شکریہ جناب! آپ کو جب کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجا دیجیے گا۔ میں خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔

شاہد صاحب: بہت خوب! جب ضرورت ہوگی تو بلا لوں گا۔

(بیرا اجازت لے کر کمرے سے چلا جاتا ہے۔)

71 دو دوستوں کے درمیان ”نصابِ تعلیم“ کے عنوان پر مکالمہ

(کامران اور نوید دونوں دوست ہیں۔ کامران اپنے دوست، نوید سے ملنے کے لیے اس کے گھر آتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

کامران: السلام علیکم!

نوید: وعلیکم السلام! کامران، بھائی کیسے ہیں؟

کامران: الحمد للہ، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں کیا ہو رہا ہے؟

نوید: کیا ہوتا بھئی، ہمارے تعلیمی اداروں میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، اس کے حوالے سے پریشان ہوں۔

کامران: ارے بھئی! کیا ہُوا نصاب کو۔

نوید: آج ہی بیٹے کے لیے جماعت پنجم انگلش میڈیم کی نصابی کتب لے کر آیا ہوں، جو کہ آکسفورڈ کمپنی کی ہیں۔ یہ بہت مہنگی اور مشکل بھی ہیں۔ یہ لیں، آپ مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔

کامران: (ایک کتاب لے کر ورق گردانی کرتا ہے۔) واقعی بھائی۔ یہ تو پانچویں جماعت کے بچے کی ذہنی استطاعت سے زیادہ ہے۔ یہ بچوں پر اضافی بوجھ ہے اور والدین کے لیے بھی پریشانی کا باعث ہے۔ وہائٹ ہیڈ کا مقولہ ہے کہ:

”علم زیادہ ہے، زندگی چھوٹی ہے۔ اس لیے بہُت زیادہ مضامین مت پڑھائیں لیکن جو کچھ پڑھائیں بھرپور پڑھائیں۔“

نوید: المیہ تو یہ ہے کہ ہمارے اپنے ہی ملک کے سکولوں میں مختلف قسم کے غیر ملکی نصاب رائج ہیں، جو کہ ہمارے ماحول، معاشرت اور مذہب سے بالکل ہم آہنگ نہیں ہیں۔

کامران: حالاں کہ ایک اچھے نصاب کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ طالب علم کو اس کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے اور معاشی سرگرمیوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بناتا ہے۔

نوید: جی ہاں! نصاب کا طالب علم کی کردار سازی میں اہم کردار ہوتا ہے اور نصاب کے ذریعے سے ہی طالب علم کی مذہبی، تہذیبی، تمدنی اور فکری تربیت ہوتی ہے۔

کامران: دراصل ہمارے ملک میں بیسیوں سے ادارے ایسے ہیں، جن کی سرپرستی امریکی اور برطانوی تعلیمی ادارے کر رہے ہیں اور ان کا نصابِ تعلیم ہمارے ماحول، معاشرت اور مذہب سے متصادم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے پاکستان کی ہر چیز کو کمتر اور مغرب کی کمتر اور گھٹیا چیزوں کو بھی اعلیٰ وارفع سمجھتے ہیں۔

نوید: آپ کی بات بالکل درست ہے۔ دراصل مغرب ایک مادہ پرست معاشرہ ہے۔ اس کا نصب العین ہمارے معاشرے سے مختلف ہے۔ ہم دین کے بغیر فلسفۂ زندگی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔
شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ:

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

کامران: ہمیں مغربی علوم اور ان کے اندازِ فکر سے استفادے میں یہ بات لازمی دیکھنا ہوگی کہ کون کون سی چیزیں ہمارے معاشرے کے لیے مفید ہیں اور کون سی نقصان دہ، باہر سے لائی ہوئی ہر چیز کو اپنے معاشرے میں سمویا نہیں جا سکتا۔

نوید: اس سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ دو طبقات میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے، ایک سیکولر اور لبرل قوتیں ہیں، دوسری طرف دینی اور مذہبی ہیں۔

کامران: ہمارا ملک ایک ہے تو نصاب بھی ایک جیسا ہونا چاہیے، تاکہ امیر، غریب کے فرق اور طبقاتی نظام کا خاتمہ ہو۔

نوید: نصاب یکساں نہ ہونے کی وجہ سے جہاں غریب بچوں میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے، وہاں وہ اپنی صلاحیتوں کو بھی بہتر طور پر استعمال میں لانے سے قاصر رہتے ہیں۔

کامران: یہ تو ہمارے حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ یکساں نصابِ تعلیم کے نفاذ کو ممکن بنائیں۔

نوید: ایسا ہی ہونا چاہیے، مگر ہمارے حکمرانوں کے بچے تو مغربی ممالک میں پڑھتے ہیں۔ یعنی "چراغ تلے اندھیرا" والی بات ہے۔

کامران: جی ہاں! دراصل یہ ہماری ذہنی غلامی کا منہ بولتا ثبوت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم ترقی کی بجائے روبہ زوال ہیں۔

نوید: کسی شاعر نے بجا فرمایا ہے کہ:

زرداری ہیں کوپلیں، کوئی سحاب سوچ آئندہ نسل کے لیے تازہ نصاب سوچ

کامران: ہمارے ہاں سیکولر اور لبرل قوتوں اور دینی اور مذہبی قوتوں کے مابین فکری ٹکراؤ ہے، جس کی وجہ سے ہم تعلیم اور نصابِ تعلیم کی کوئی سمت متعین نہیں کر سکے۔ بس تعلیم کے معاملے میں بے مقصد تجربات کیے جا رہے ہیں۔

نوید: ہمارے طلبہ کی زیادہ تر صلاحیتیں انگریزی اور سائنسی مضامین کو رٹنے میں صرف ہو جاتی ہیں، جب کہ اسلامیات، مطالعہ اور اُردو کو غیر ضروری اور طلبہ پر عملی بوجھ سمجھا جاتا ہے۔

کامران: اُن کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جس طرح چیچک کا ٹیکہ لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ ٹیکہ اُس شخص کے حق میں کسی طرح بھی نقصان دہ نہیں ہو سکتا، جس کو ٹیکہ لگایا گیا ہے۔ دنیا میں گمراہ کن نظریات بھی چیچک کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، اس لیے اردو، مطالعہ پاکستان اور اسلامیات لازمی مضمون ہی طلبہ کو مغربی نظریات کی چیچک سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

نوید: بہت خوب! آپ نے بجا فرمایا ہے۔ درحقیقت ہمیں اپنے نصاب کو جہاں جدید بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا، وہاں اس میں یکسانیت و ہم آہنگی بھی پیدا کرنی ہوگی۔

کامران: حکومت کو چاہیے کہ وہ ان مسائل کا سنجیدگی سے جائزہ لے اور تمام تعلیمی اداروں میں یکساں نصاب رائج کرے۔

نوید: کامران بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔

کامران: اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کو قبولیت عطا فرمائے۔

نوید: آمین

کامران: اچھا بھائی نوید مجھے اجازت دیں۔ میں گھر چلتا ہوں۔

نوید: بہت شکریہ کامران بھائی۔ آپ نے بہت مفید معلومات فراہم کیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں برکت عطا فرمائے۔
(کامران، نوید سے اجازت لے کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

72 استاد اور شاگرد کے درمیان تاریخ پاکستان کے موضوع پر مکالمہ

(فیصل آباد 13ء، گوجرانوالہ، لاہور 14ء، لاہور 15ء، راولپنڈی بورڈ 17)

(جماعت کے کمرے میں لڑکے شور کر رہے ہیں۔ مطالعۂ پاکستان کا پیریڈ ابھی شروع ہوا ہے۔ استاد صاحب تشریف لاتے ہیں تو جماعت میں خاموشی چھا جاتی ہے۔)

استاد: السلام علیکم! بچو

شاگرد: وعلیکم السلام! جناب

استاد: پیارے بچو! کل ہم نے تاریخِ پاکستان کے بارے میں پڑھا تھا۔ کیا آپ سب کو یاد ہے؟

شاگرد: جی جناب! آپ نے بڑی تفصیل سے بتایا تھا، اس لیے ہمیں اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے۔

استاد: شعیب! بتائیے، سب سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں اسلامی سلطنت کی بنیاد کس نے رکھی تھی؟

شعیب: جناب! محمد بن قاسمؒ نے برصغیر میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اور بعد میں آنے والے فاتحین کے لیے سلطان محمود غزنویؒ اور سلطان محمد غوریؒ نے راستہ ہموار کیا تھا۔

استاد: شاباش شعیب! آپ نے تو کمال کر دیا۔

شعیب: شکریہ جناب! میں نے کل آپ کی باتیں بڑی توجہ سے سُنی تھیں۔

استاد: (عمیر سے مخاطب ہو کر) عمیر! بتائیے۔ محمد بن قاسم نے کس سنہ میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا؟

عمیر: جناب! محمد بن قاسمؒ نے سنہ 712ء میں حملہ کیا تھا۔ انھوںؒ نے راجہ داہر کو شکست دے کر سندھ میں اسلامی حکومت قائم کی تھی۔

استاد: شاباش عمیر۔

عمیر: شکریہ جناب!

استاد: عمران! بتائیے، سلطان محمود غزنویؒ نے ہندوستان پر کتنے حملے کیے اور اسلامی حکومت کو کس قدر وسعت دی تھی؟

عمران: جناب! سلطان محمود غزنویؒ نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے۔ انھوںؒ نے پنجاب اور سندھ کو اسلامی حکومت میں شامل کیا تھا۔

استاد: شاباش عمران! خوب محنت کرو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے گا۔

عمران: شکریہ جناب!

استاد: عامر! بتائیے۔ مغلیہ سلطنت کا بانی کون تھا؟ اور اس خاندان کے مشہور حکمرانوں کے نام بھی بتائیے۔

عامر: جناب! مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر تھا اور اس خاندان کے مشہور بادشاہ ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگزیب اور بہادر شاہ ظفر ہیں۔

استاد: عامر! خوب جواب دیا ہے۔

عامر: شکریہ جناب!

استاد: احمد! بتائیے، ہندوستان پر مسلمانوں کی ہزار سالہ اسلامی حکومت کا خاتمہ کس بادشاہ پر ہوا؟

احمد: جناب! ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت بہادر شاہ ظفر پر ختم ہوئی اور انگریز ہندوستان کے حاکم بن بیٹھے۔

استاد: شاباش احمد! اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں اضافہ فرمائے۔

احمد: آمین، جناب شکریہ!

استاد: اویس! بتائیے۔ ہندوؤں کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ کیسا تھا؟

اویس: جناب! ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کی سخت مخالفت کی اور دشمن رہے۔

استاد: یہ حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کی مخالفت کی۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد پور۔ ہندوستان پر حکومت قائم کریں گے۔

اویس: شکریہ جناب!

استاد: حارث! آپ بتایئے۔ پاکستان کس طرح قیام پزیر ہوا؟

حارث: جناب! برصغیر میں مسلمانوں کی حالت ابتر تھی۔ علامہ اقبالؒ نے نظریۂ پاکستان پیش کیا۔ جسے قائدِ اعظمؒ کی بے مثال جدوجہد انگریزوں اور ہندوؤں کو شکست دے کر قائل کرلیا کہ برصغیر کے وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، پاکستان کہلائیں سے آزاد کردیے جائیں۔ چناں چہ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا اور قائدِ اعظمؒ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

استاد: ثاقب! بتایئے۔ پاکستان کے قیام کا اصل مقصد کیا تھا؟

ثاقب: جناب! پاکستان کے قیام کا اصل مقصد اسلام کا نفاذ تھا۔ وہ اسلام جس کا نمونہ آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں مسلمانوں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔

استاد: شاباش بچو! آپ سب نے بھرپور تیاری کی ہے۔ لیکچر کا وقت ختم ہورہا ہے۔ ان شاء اللہ کل دوبارہ ملیں گے۔ اللہ حافظ

شاگرد: اللہ حافظ

(پیریڈ کی گھنٹی بجتے ہی استاد صاحب جماعت کے کمرے سے تشریف لے جاتے ہیں۔)

73 ٹیکسی ڈرائیور اور مسافر کے درمیان مکالمہ

(علی شہر کی جانب جانے والی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہتا ہے۔ ٹیکسی اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک جاتی ہے تو علی ٹیکسی ڈرائیور سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

علی : بھائی! مجھے لاری اڈا تک جانا ہے۔ چلو گے؟

ڈرائیور : جی نہیں۔

علی : یہ اچھا مذاق ہے۔

ڈرائیور : جناب! اسے مذاق نہ سمجھیں۔

علی : تو اور کیا سمجھوں؟

ڈرائیور : جناب! دراصل اس وقت رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ راستہ خطرناک ہے۔

علی : بھائی! ٹیکسی میں کس بات کا خطرہ ہے آپ کو؟

ڈرائیور : جناب! آپ میری بات نہیں سمجھے۔ درحقیقت مجھے گھر جانا ہے۔

علی : بھائی! میں کافی دیر سے ٹیکسی کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں۔ اگر آپ مجھے لاری اڈا نہ لے کر گئے تو شاید میری گاڑی نکل جائے۔

ڈرائیور : (سوچتے ہوئے) کون سی گاڑی پر جانا ہے؟

علی : مجھے علی ایکسپریس پر لاہور جانا ہے۔

ڈرائیور : اچھا جناب! اگر آپ مجبور کرتے ہیں تو میں لے چلتا ہوں۔

علی : کرایہ کیا لوگے؟

ڈرائیور : پانچ سو روپے لوں گا۔

علی : یہ تو بہت زیادہ ہیں؟ تین سو کافی ہیں۔

ڈرائیور : جناب! آپ کو معلوم ہے کہ پیٹرول مہنگا ہوگیا ہے۔

علی : پیٹرول والی بات آپ نے کیا خوب سنائی ہے۔ چار روپے پیٹرول کا نرخ بڑھتا ہے اور کرایہ بیس روپے فی لیٹر کے حساب سے بڑھا دیتے ہیں۔ کچھ خدا خوفی کرو۔

ڈرائیور : جناب! ہم بھی مجبور ہیں۔ ہم معقول کرایہ ہی لیتے ہیں۔ کوئی ناجائز تو نہیں لیتے۔

علی : آپ کی کیا مجبوریاں ہیں؟

ڈرائیور : جناب! ہم دیہاڑی دار ملازم ہیں۔ میں نے یہ ٹیکسی کرائے پر لی ہوئی ہے اور مجھے روزانہ کے حساب سے ایک ہزار روپے ٹیکسی کے مالک کو دینے پڑتے ہیں۔

علی : (ٹیکسی میں سوار ہوتے ہوئے) اچھا، چار سو روپے لے لینا، چلو اور اب دیر نہ کرو۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔

ڈرائیور : چلیے جناب! جیسے آپ کی مرضی (ٹیکسی چل پڑتی ہے)

علی : اُفوہ! اتنا ظلم، گرمی اور گھٹن سے میری جان نکل رہی ہے۔

ڈرائیور : جناب! گاڑی کا اے۔سی خراب ہے۔

علی : اگر یہی بات تھی تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اب اتنی گرمی میں سفر کیسے طے ہوگا؟

ڈرائیور : معذرت خواہ ہوں جناب! آپ گاڑی کا شیشہ نیچے کرلیں۔

علی : آپ لوگوں کے ایسے رویے کے باعث دوسرے ٹیکسی والے بھی بدنام ہوتے ہیں۔

ڈرائیور : جناب! حقیقت تو یہ ہے کہ میں سواری سے جو زیادہ پیسے وصول کرتا ہوں، ان میں سے میں نے ٹیکسی یونین والوں کو بھی دینے ہوتے ہیں اور پولیس والوں کو بھی، تاکہ چالان سے بچا جاسکے۔

علی : پولیس والوں کو کیوں دیتے ہو۔ علاوہ ازیں ٹیکسی یونین والوں کے خلاف اور پولیس والوں کے خلاف آپ آواز کیوں نہیں اٹھاتے؟

ڈرائیور : بس جناب! اگر ہمارا کسی دن چالان ہوجائے تو ہماری ساری دیہاڑی ختم ہوجاتی ہے۔ اس لیے ہم چالان سے بچنے کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔

علی : یہ تو آپ کے ساتھ بہت بُرا ہوتا ہے۔

ڈرائیور : مجھے لگتا ہے کہ آپ کا سٹاپ آگیا۔

علی : ہاں بھئی، بس! ادھر ذرا آگے اتار دو۔

ڈرائیور : یہ لیں جناب!

علی : یہ لیں آپ کا کرایہ

ڈرائیور : شکریہ جناب!

: (ٹیکسی ڈرائیور شکریہ ادا کرکے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔)

74 استاد اور شاگرد کے درمیان معاشرے کی غلط رسومات اور ان کی روک تھام کے موضوع پر مکالمہ

(استادِ محترم لائبریری میں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کررہے ہیں۔ اس دوران میں ان کا شاگرد رضوان آتا ہے اور ہم کلام ہوتا ہے۔)

شاگرد : السلام علیکم جناب! آپ خیریت سے ہیں؟

استاد : وعلیکم السلام! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ آپ سنائیں پڑھائی ٹھیک ہورہی ہے؟

شاگرد : جی جناب! پڑھائی بہت اچھی ہورہی ہے۔

استاد : شاباش! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

شاگرد : جناب! آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے کالج میں تقریری مقابلہ ہورہا ہے۔ اس لیے مجھے آپ سے کچھ رہنمائی لینی ہے۔

استاد : جی بیٹا! بتاؤ کون سا عنوان ہے؟

شاگرد : ''ہمارے معاشرے کی غلط رسومات اور ان کی روک تھام''

استاد : یہ عنوان تو بالکل آسان ہے۔

شاگرد : جناب! میرے پاس کچھ معلومات ہیں مگر میں کچھ اور معلومات بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ مقابلے میں اول پوزیشن حاصل کرسکوں۔

استاد : پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارے معاشرے میں کون سی غلط رسومات ہیں؟

شاگرد : شادی بیاہ کی رسومات اور کسی کی وفات پر ادا کی جانے والی رسومات۔

استاد : بالکل ٹھیک کہا۔ لیکن ایک اور رسم بھی ہے، جس نے ہمارے معاشرے کو تباہ کر دیا ہے۔ وہ جہیز کی رسم ہے۔

شاگرد : جی جناب! یہ تو آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔

استاد : بیٹا! اگر ہم برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے آزادانہ میل جول کا عرصہ تقریباً ایک ہزار سال کا ہے۔ اس طویل عرصے کے دوران میں ''حکم تا شیر صحبت کا اثر'' کے مصداق ہندو معاشرے کی بہت سی بُری رسومات مسلمانوں نے اپنا لیں۔

شاگرد : آپ نے بالکل بجا فرمایا جناب! ہمارے ہاں آج کل یہ رسومات اس قدر راسخ ہو چکی ہیں کہ ایک غریب شخص کا بھی ان سے بچنا محال ہے۔

استاد : ہاں بیٹا! ہمارے قومی شاعر علامہ محمد اقبالؒ نے اس کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے۔

؎ حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

شاگرد : بے شک! یہ تو آپ نے بہت اچھی بات فرمائی۔

استاد : اب شادی کی رسومات کو ہی دیکھ لیں۔ پہلے مہندی اور اُبٹن کی رسومات، پھر سہرا بندی، اس کے بعد بارات اور نہ جانے کون کون سی رسومات کو ادا کیا جاتا ہے۔

شاگرد : جی جناب! آج کل تو دس دس دن شادی کی رسومات ادا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

استاد : جی بیٹا! آج صورت حال یقیناً ایسی ہو چکی ہے، ہمارے نام تو مسلمانوں والے ہیں لیکن رہن سہن ہندوؤں کے مشابہ ہو چکا ہے۔

شاگرد : جناب! خاندان میں جب کوئی فوت ہو جائے تب بھی تو مختلف رسومات ادا کی جاتی ہیں۔

استاد : جی بیٹا! چا نہیں ہمارے معاشرے کو کیا ہو گیا ہے؟ گویا ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ شاید اسی لیے اقبالؒ اس بارے میں بجا فرماتے ہیں:

؎ وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

شاگرد : جناب! ہم ایسی رسومات سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

استاد : درحقیقت ہم آپ ﷺ کی سیرت طیبہ پر عمل کر کے اس مصیبت سے جان چھڑا سکتے ہیں۔

شاگرد : جی جناب! بالکل بجا فرمایا آپ نے، حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر عمل کر کے ہی ہم زندگی کے بے شمار مسائل سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔

استاد : شاباش! اس کے علاوہ ہمیں فضول خرچی سے بچنا ہوگا۔ کیوں کہ اسی اسراف کی بدولت بعد ازاں بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (سورۃ الاعراف:31)

ترجمہ: ''بے شک فضول خرچی کرنے والوں کو وہ (اللہ) پسند نہیں کرتا۔''

شاگرد : جی جناب! آپ کی حکمت و دانائی سے معمور باتوں سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے کامیابی عطا فرمائے۔

استاد : اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی و کامرانی عطا فرمائے، میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

شاگرد : شکریہ جناب! اللہ حافظ

(استادِ محترم لیکچر دینے کے لیے گیارہویں جماعت کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔)

75 دو دوستوں کے درمیان ''فضول خرچی'' کے موضوع پر مکالمہ

(احمد اور وسیم دونوں دوست ہیں اور ایک ہی محلّہ میں رہتے ہیں۔ احمد، وسیم سے ملنے کے لیے اس کے گھر آتا ہے اور دونوں میں سلسلہ کلام کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے۔)

احمد : السلام علیکم!

وسیم : وعلیکم السلام! کیسے ہو؟

احمد : میں ٹھیک ہوں، آپ سنائیں۔ کیا کر رہے ہیں؟

وسیم : بس بھئی! دو ہفتوں کے بعد بڑے بھائی کی شادی ہے۔ شادی کے حوالے سے کچھ خریداری کرنی ہے۔

احمد : کیا خریداری کرنی ہے؟

وسیم : بھئی! بہت سے کپڑے خریدنے ہیں اور جوتے بھی لینے ہیں، ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی چاہییں۔

احمد : افسوس! تمھاری یہ خریداری والدین کے لیے مصیبت کا باعث بنے گی۔

وسیم : بھئی! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، فیشن کا زمانہ ہے۔ کچھ زمانے کے ساتھ بھی چلنا چاہیے۔

احمد : لگتا ہے کہ تم ایک آزاد خیال لڑکے ہو جو فضولیات پر اتنا روپیا خرچ کرنے جا رہے ہو۔

وسیم : انسان کو پیسوں کی فکر نہیں کرنی چاہیے بلکہ زمانے کے مطابق چلنا چاہیے۔

احمد : جناب! یہ تمھاری خام خیالی ہے۔ یہی رقم تم کسی اچھے کام پر بھی خرچ کر سکتے ہو، اسراف سے بعد ازاں بہت سے مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (سورۃ الاعراف:31)

ترجمہ: ''بے شک فضول خرچی کرنے والوں کو وہ (اللہ) پسند نہیں کرتا۔''

وسیم : تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن یہ میری عزت کا مسئلہ ہے۔

احمد : بھئی! ایسی فضول خرچیوں نے ہمارے معاشرے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ پہلے تو لوگ شادیوں پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں اور بعد میں قرض تلے دب جاتے ہیں۔

وسیم : احمد! تم بھی کیا عجیب باتیں کر رہے ہو۔ دراصل روپیا ایسے موقعوں پر ہی خرچ کیا جاتا ہے۔

احمد : بھئی! ہمارے معاشرے میں اکثر رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جن کو ختم کرنا ہمارے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں انھیں بے اعتدالیوں کے باعث ہمارا معاشرہ بہت سے مسائل میں گھر گیا ہے۔ بقولِ مرزا غالب:

؎ بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

وسیم : ہاں! ویسے تم نے ٹھیک کہا ہے۔ ہمارے معاشرے کے اکثر لوگ نمود و نمائش کے لیے فضول خرچی کرتے نظر آتے ہیں۔

احمد : دیکھو بھئی! تمھارے والدِ محترم ایک سکول ماسٹر ہیں۔ جن کی آمدنی محدود ہونے کے باعث، تمھیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ تم فضول خرچیاں کرتے پھرو۔

وسیم : ہاں یہ تو ہے۔ لیکن پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟

احمد : دیکھو بھئی! دینِ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور یہ دین ہمیں میانہ روی کا درس دیتا ہے۔

وسیم : میں تمھاری بات سے بالکل اتفاق کرتا ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ میرے دوست اور رشتہ دار خواہ مخواہ باتیں بنائیں گے۔

احمد : لوگوں کا کیا ہے، ان کا تو کام ہی دوسروں پر کیچڑ اُچھالنا ہے۔ اس لیے تمھیں ان کی باتوں پر دھیان دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اس موقع پر دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے رسول اکرم ﷺ کا کیا فرمان مبارک ہے۔

وسیم : ہاں بھئی! یہ بات تو ہے، اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنی بڑی غلطی کرنے جا رہا تھا۔

احمد : مجھے خوشی ہے کہ تمھیں میری بات سمجھ آ چکی ہے، درحقیقت سادہ کپڑوں میں ہی انسان پُروقار نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہمیں فضول خرچی سے بچنا چاہیے۔

وسیم : جی ہاں! تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔
احمد : اچھا بھائی وسیم! اب مجھے اجازت دو۔ اللہ حافظ
وسیم : اللہ حافظ
(احمد اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

76 دو دوستوں کے درمیان ''نماز کی پابندی'' کے بارے میں مکالمہ

(دانیال اور عثمان دونوں دوست ہیں، چھٹی کا دن ہے، دانیال اپنے دوست عثمان سے ملنے کے لیے آتا ہے اور یوں ہم کلام ہوتا ہے۔)

دانیال : السلام علیکم! عثمان بھائی، کیسے ہو؟
عثمان : وعلیکم السلام! الحمدللہ، آپ سنائیں؟
دانیال : میں ٹھیک ہوں، لیکن آپ پریشان کیوں ہیں؟
عثمان : بس بھئی! اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کے حال پر رحم فرمائے۔
دانیال : جناب! کچھ تو بتائیں کہ کیا ہوا؟
عثمان : بات دراصل یہ ہے کہ اس زمانے میں دین کے حوالے سے جتنی بے توجہی کی جا رہی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، حتیٰ کہ اہم ترین عبادت نماز جو ایمان کے بعد تمام فرائض پر مقدم ہے اور قیامت کے روز سب سے پہلے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا، اس سے بھی نہایت غفلت اور لاپروائی کی جا رہی ہے۔
دانیال : جی ہاں! بالکل ایسا ہی ہے۔ بس افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے کچھ لوگ سرے سے نماز کی پروا ہی نہیں کرتے۔
عثمان : حالاں کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔
دانیال : عثمان بھائی! پھر بھی لوگ اس کی پروا نہیں کرتے۔
عثمان : جناب! نماز دین کا ستون ہے۔ جو شخص نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے کوئی دُعا مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دُعا قبول فرما لیتے ہیں خواہ فوراً یا کسی مصلحت سے کچھ دیر کے بعد مگر قبول ضرور فرماتے ہیں۔
دانیال : آپ نے بجا فرمایا ہے۔
عثمان : پیارے دوست! درحقیقت نماز انسان کو اس بات کا درس دیتی ہے کہ اگر انسان کی جبیں جھکے تو صرف اللہ تعالیٰ کے در پر، نہ کہ باطل قوتوں کے سامنے بقولِ علامہ اقبالؒ:

؎ یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

دانیال : یہ تو آپ نے درست کہا۔ لیکن آج کل ہم دنیوی کام کاج میں بُری طرح پھنس چکے ہیں کہ نماز کے لیے وقت نکالنا نہایت ہی مشکل ہو رہا ہے۔
عثمان : بھائی! شاید تم اس بات سے ناواقف ہو کہ ہمارے مذہب اسلام نے زندگی کے ہر پہلو میں توازن رکھا ہے۔ اس لیے حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:
''میں تو سوتا ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، عائلی زندگی گزارتا ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو۔ تمھارے نفس کا تم پر حق ہے تمھاری آنکھوں کا تم پر حق ہے۔ تمھارے اہل وعیال کا تم پر حق ہے تمھارے مہمان کا تم پر حق ہے، ہر حق اس کے حق دار کو ادا کرو۔ روزہ بھی رکھو افطار بھی کرو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو۔''
دانیال : جی ہاں عثمان بھائی! بجا فرمایا آپ نے، حقیقت یہ ہے کہ ہم بہت غفلت کا شکار ہیں۔

عثمان : دراصل اس دنیا میں جس نے بھی دینِ اسلام کی تعلیمات سے روگردانی کی وہ ناکام و نامراد ٹھہرا۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:
''جس شخص کی ایک نماز بھی فوت ہو گئی وہ ایسا ہے کہ گویا اس کے گھر کے لوگ اور مال و دولت سب چھین لیا گیا ہو۔''
دانیال : جناب! لیکن ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی تو موجود ہیں جو ظاہری اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں مگر خود عمل نہیں کرتے۔
عثمان : میں آپ کی بات تسلیم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ علاوہ ازیں ہمیں بھی نماز پنجگانہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
دانیال : آپ کی باتوں سے میرا دل مطمئن ہوا ہے اور نماز کی اہمیت و افادیت سے بھی آگاہی ہوئی ہے۔
عثمان : اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔
دانیال : اچھا بھائی عثمان! اب مجھے اجازت دیں۔ اللہ حافظ
عثمان : اللہ حافظ
(دانیال اجازت لینے کے بعد گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

77 دو دوستوں کے درمیان رشوت ستانی کے بارے میں مکالمہ

(راولپنڈی 2019)

(احمد لائبریری میں کسی کتاب کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہے کہ نوید اس کے پاس آتا ہے اور ہم کلام ہوتا ہے۔)

نوید : السلام علیکم!
احمد : وعلیکم السلام! کیسے ہو نوید؟
نوید : میں تو ٹھیک ہوں مگر تم کیوں پریشان ہو؟
احمد : بس یار مجھے رشوت ستانی کے موضوع پر ایک مضمون لکھنا ہے۔
نوید : تو اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ یہ تو عام اور آسان موضوع ہے، کیوں کہ آج کل تو رشوت کا بازار خوب گرم ہے۔
احمد : وہ کیسے؟
نوید : بھئی! آج کل رشوت ستانی نے معاشرے کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کسی بھی محکمہ میں چلے جائیں، رشوت کے بغیر کام نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جائز کام کروانے اور اپنا حق لینے کے لیے بھی رشوت دینی پڑتی ہے۔
احمد : جی ہاں! آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ آج کل معاشرے کا ہر شخص راتوں رات امیر بننے میں مصروف ہے۔
نوید : دراصل ہمارے ملک میں رشوت خوری کی وبا اس قدر پھیل چکی ہے کہ بے گناہ غریب، مجرم ٹھہرتا ہے اور صاحبِ ثروت سرمایہ دار رشوت کے جادو سے بے گناہ اور پاک باز بن جاتا ہے۔
احمد : ہاں جناب! یہ تو ہے۔
نوید : احمد بھائی! ہمارے معاشرے میں رشوت دے کر بہت سے کام نکلوائے جا سکتے ہیں مثلاً: رشوت دے کر آپ جھوٹے گواہوں کا انتظام کر سکتے ہیں، من گھڑت میڈیکل رپورٹس حاصل کر سکتے ہیں اور زمینوں پر ناجائز قبضہ کر سکتے ہیں۔
احمد : یہ بات درست ہے، مگر لوگ اس سے بچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔
نوید : حالاں کہ رشوت لینے اور دینے والے دونوں کے لیے وعید ہے، لیکن پھر بھی اس فعلِ بد سے نہیں بچتے۔ حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
''رشوت لینے والا اور دینے والا (دونوں) جہنمی ہیں'' (طبرانی)
احمد : جی ہاں! اس وعید کو سننے کے بعد بھی انسان نہیں سمجھتا، کیوں کہ اس لعنت نے غلط اور صحیح کو پرکھنے کی صلاحیت کو ختم کر دیا ہے۔

نوید : جی جناب! درحقیقت رشوت ایک ایسی معاشرتی برائی ہے کہ جس نے حق دار کو اس کے حق سے محروم رکھا ہوا ہے۔ جن کے تعلقات افسروں کے ساتھ ہوتے ہیں وہ ان کو رشوت دے کر اپنا کام کروا لیتے ہیں۔ غریب آدمی بے چارا محروم رہ جاتا ہے اور اس طرح وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بقولِ شاعر:

اونچے پیڑوں کا ثمر اس دور میں اس کو ملا
قدوقامت میں جو خاطر مجھ سے کچھ اونچا نہ تھا

احمد : آپ کی بات بالکل درست ہے۔ اس عمل سے نااہل افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

نوید : بھئی! رشوت ایک ایسی لعنت ہے جس سے ہر ناجائز کام فوراً ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں شاہراہوں پر ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے بھی رشوت دے کر بچ جاتے ہیں۔

احمد : آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ حالاں کہ اسلام نے سختی سے اس کی مذمت کی ہے۔

نوید : آج غریب آدمی مجبوراً رشوت دیتا ہے کیوں کہ رشوت کے بغیر وہ اپنا کوئی کام بھی نہیں نکلوا سکتا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

جو گراں تھے سینۂ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر
جنھیں زندگی کا شعور تھا انھیں بے زری نے مٹا دیا

احمد : واہ واہ بھئی! سخن شناس ہو گئے ہو۔

نوید : یار کیا کریں آج کل حالات نے ہمیں سخن شناس بننے پر مجبور کر دیا ہے۔

احمد : آخر ہم رشوت ستانی جیسے سنگین مسئلے سے کیسے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں؟

نوید : اگر آج ہم سچے دل سے اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو جائیں تو اس برائی سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ہماری حکومت کو بھی اس سلسلے میں ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔

احمد : واقعی یہی اس کا بہتر حل ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی کیوں کہ اب مجھے اس موضوع پر کافی مواد میسر آ گیا ہے۔

نوید : کوئی بات نہیں، یہ تو میرا فرض تھا۔

احمد : نوید بھائی مجھے اجازت دیں۔ میرا اُردو کا لیکچر شروع ہوا چاہتا ہے۔ خدا حافظ

نوید : خدا حافظ

(احمد، نوید سے اجازت لے کر اپنی جماعت کے کمرے کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

78 دو دوستوں کے درمیان ''گداگری ایک لعنت'' کے موضوع پر مکالمہ

عثمان بازار کی طرف خریداری کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ اس کی ملاقات سہیل سے ہوتی ہے۔ اسی اثنا میں ایک فقیر ان کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آفت کا مارا چار بچوں کا باپ ہوں۔ براہِ مہربانی میری مدد کی جائے۔ سہیل اسے دس روپے دے دیتا ہے۔)

سہیل : یہ گداگر بھی آج کل بس درِ دوسر بنے ہوئے ہیں۔

عثمان : سہیل بھائی یہ کیا ماجرا ہے؟

سہیل : جناب! وہی جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک شخص جو نہایت ہٹا کٹا ہے مگر بھیک مانگ رہا ہے۔

عثمان : آپ کی بات بالکل درست ہے۔ آج کل ان ''گداگروں'' نے لوگوں کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔

سہیل : جی جناب! اپاہج اور معذور لوگ تو ایک طرف، موجودہ دور میں تو کاہل اور آرام طلب افراد نے کوشش، جدوجہد، حرکت اور غیرت جیسی خوبیوں کو چھوڑ کر گداگری کو اپنا مستقل پیشہ بنا لیا ہے۔

عثمان : ہاں جناب! یہ تو ہے۔

سہیل : عثمان بھائی! آج کل ہمارے معاشرے میں بھیک مانگنے کے بہت سے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ کوئی التجا کر کے مانگتا ہے تو کوئی فریاد کر کے، کوئی جعلی معذور بن جاتا ہے تو کوئی بے یار و مددگار مسافر کی شکل میں اپنے نقصان کا رونا روتے ہوئے بھیک مانگتا ہے۔

عثمان : بھئی! کیا ان لوگوں کو بھیک مانگتے وقت شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا؟

سہیل : دراصل حرص و ہوس ایسے لوگوں کے دل سے عزت و غیرت کو ختم کر دیتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

قناعت ہی وہ دولت ہے جو ہرگز کم نہیں ہوتی
مگر چشمِ ہوس اس راز کی محرم نہیں ہوتی

عثمان : یہ بات درست ہے، مگر لوگ اس سے بچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

سہیل : بھئی! مذہب اسلام سختی سے گداگری کی مذمت کرتا ہے۔ حضور اکرم خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ:
''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور اوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا ہاتھ ہے اور نیچے والا ہاتھ مانگنے والا ہاتھ ہے'' (صحیح بخاری: 1429)

عثمان : جی ہاں سہیل بھائی! بجا فرمایا آپ نے، حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو پھر بھی شرم نہیں آتی۔

سہیل : دراصل اس دنیا میں جس نے بھی دینِ اسلام کی تعلیمات سے روگردانی کی وہ ناکام و نامراد ٹھہرا، ارشادِ نبوی ﷺ ہے:
''جو آدمی برابر سوال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ قیامت میں اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا''۔

عثمان : جی ہاں جناب! اس وعید کو سننے کے بعد بھی لوگ نہیں سمجھتے، کیوں کہ گداگری جیسی لعنت نے ان کی غلط اور صحیح کو پرکھنے کی صلاحیت کو ختم کر دیا ہے۔

سہیل : المیہ یہ ہے کہ ان بھکاریوں نے اسلامی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال کر ہمارے معاشرے کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ حالاں کہ امداد کے حق دار اصل وہ لوگ ہیں، جو اپنا بھید کسی کو نہیں بتاتے۔ ان کی آنکھوں سے شاید بے بسی معلوم ہو جائے، ورنہ غربت کے باوجود ہاتھ پھیلانا اچھا نہیں سمجھتے۔ بقولِ مخمور دہلوی:

فقیری میں بھی مجھ کو مانگنے سے شرم آتی ہے
سوالی ہو کے مجھ سے ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا

عثمان : واہ واہ بھئی! سخن شناس ہو گئے ہو۔

سہیل : یار کیا کریں آج کل حالات نے ہمیں سخن شناس بننے پر مجبور کر دیا ہے۔

عثمان : آخر ہم ''گداگری'' جیسے سنگین مسئلے سے چھٹکارا کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

سہیل : اگر آج ہم سچے دل سے اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو جائیں تو اس برائی سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ہماری حکومت کو بھی چاہیے کہ حقیقی معذور اور اپاہج افراد کے لیے خوراک اور رہائش کا بندوبست کرے اور صحت مند افراد کو مناسب روزگار دے، تاکہ ان کے اندر عزتِ نفس کا احساس اُجاگر ہو۔

عثمان : واقعی یہی اس کا بہتر حل ہے۔ بہت شکریہ آپ نے بہت مفید معلومات فراہم کیں۔

سہیل : کوئی بات نہیں عثمان بھائی! یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں اضافہ فرمائے۔

عثمان : آمین۔ اب میں چلتا ہوں۔
اللہ حافظ

(عثمان، سہیل سے اجازت لے کر بازار کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

79 دو دوستوں کے درمیان ''کورونا ایک وبا'' کے موضوع پر مکالمہ (یا) دو طلبا کے مابین کووِڈ نائنٹین (Covid-19) کے بارے میں مکالمہ

(احمد لائبریری میں منہ پر ماسک لگائے اخبار کے مطالعے میں مصروف ہے۔ نوید اس کے قریب آتا ہے اور دونوں کے درمیان گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔)

نوید : السلام علیکم، احمد بھائی کیا حال ہے؟

احمد : وعلیکم السلام، میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟

نوید : میں بھی ٹھیک ہوں۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟

احمد : جی، بیٹھیں۔ لیکن ہمارے درمیان تین فٹ کا فاصلہ ہونا ضروری ہے۔

نوید : یار، کورونا کی اس وبا میں جو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر زور دیا جاتا ہے اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔

احمد : اگر آپ کو اس وبا کا صحیح علم ہو تو آپ کو پتا چلے گا کہ یہ احتیاطی تدابیر کیوں ضروری ہیں۔

نوید : ذرا بتایئے گا کہ یہ کورونا یا کووڈ نائنٹین اصل میں ہے کیا؟

احمد : کورونا ایک وائرس ہے۔ یہ سانس کی بیماری کا سبب بنتا ہے۔ لیکن 2019ء کے آخر میں کورونا کی جو قسم سامنے آئی ہے اس کو اُول کورونا یا کووڈ نائنٹین کا نام دیا گیا ہے۔

نوید : یہ وائرس آیا کہاں سے ہے اور یہ انسانوں کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

احمد : 2019ء میں چین کے شہر ووہان میں اس وائرس سے متاثرہ افراد ہسپتالوں میں آنا شروع ہوئے تھے۔ اس کے بعد بہت کم مدت میں یہ وائرس پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اس سے متاثرہ افراد میں شدید بخار، نزلہ، خشک کھانسی اور سانس لینے میں دشواری جیسی تکالیف پائی جاتی ہیں۔

نوید : یہ وائرس دوسرے افراد میں کس طرح منتقل ہوتا ہے؟

احمد : یہ وائرس بہت جلد دوسرے افراد میں منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لیے یہ بہت خطرناک ہے۔ متاثرہ افراد کے کھانسنے، چھینکنے اور ہاتھ ملانے سے یہ دوسرے افراد میں منتقل ہو جاتا ہے۔

نوید : کیا اسی لیے ماسک پہننا اور فاصلہ رکھنا ضروری ہے؟

احمد : جی ہاں، آپ بالکل درست سمجھے۔ ان احتیاطی تدابیر پر عمل کر کے ہم اس خطرناک بیماری کے پھیلاؤ کو روک سکتے ہیں۔ احتیاط کرنا بھی حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہے:

"جب تم سن لو کہ کسی جگہ طاعون کی وبا پھیل رہی ہے تو وہاں مت جاؤ لیکن جب کسی جگہ یہ وبا پھوٹ پڑے اور تم وہیں موجود ہو تو اس جگہ سے نکلو بھی مت"۔ (صحیح بخاری: 5728)

نوید : احمد بھائی! اس کی ویکسین کس حد تک مؤثر ہے؟

احمد : ماہرین نے بڑی محنت سے اس کی ویکسین تیار کی ہے۔ ویکسین کی وجہ سے کرونا کی وبا قابو کرتے ہیں بہت مدد ملی ہے۔ پاکستان میں بھی حکومت کی طرف سے ویکسین مفت لگائی گئی ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں اموات کی شرح دنیا کے مقابلے میں بہت کم رہی ہے۔

نوید : لوگوں کو مفت ویکسین لگا کر اس وبا سے محفوظ رکھنے کا کام حکومت کا بہت بڑا اقدام ہے۔

احمد : جی ہاں، شروع میں لوگ ویکسین لگوانے سے ڈرتے تھے لیکن اس کے مثبت نتائج دیکھ کر لوگوں کا خوف دور ہو گیا۔

نوید : کیا ویکسین لگوانے کے بعد بھی احتیاطی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی؟

احمد : جی، بالکل۔ ویکسین لگوانے کے باوجود محتاط رہنا ضروری ہے۔ دراصل یہ وبا ان لوگوں کے لیے زیادہ خطرناک ہے جو پہلے سے مختلف بیماریوں کا شکار ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے مریضوں کو چاہیے کہ وٹامن C اور فائبر کا زیادہ استعمال کریں جیسا کہ امرود، کیو، سیب، ادرک، قہوہ، پالک، شہد وغیرہ۔

نوید : اس وبا سے بچاؤ کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

احمد : ہمیں اپنے ہاتھوں کی صفائی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ ہجوم میں جانے سے گریز کرنا چاہیے۔ ماسک کے استعمال اور جسمانی فاصلے کا خیال رکھیں۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ دنیا کو اس وبا سے نجات دے۔

نوید : ہاں دوست، یہ وبا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تنبیہ ہے کہ ہم اپنے اعمال درست کریں اور گناہوں سے توبہ کریں۔

احمد : یقیناً ایسا ہی ہے کیوں کہ قرآن میں ارشاد ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ : (سورۃ الروم:41)

ترجمہ: "خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب سے فساد پھیل گیا ہے"۔

نوید : جی بالکل۔ ہمیں قرآن اور احادیث سے رہنمائی لے کر زندگی کو آسان اور کامیاب بنانا چاہیے۔

احمد : ہمیں چاہیے کہ ہم صبح اور شام کے اوقات میں مخلوق کے شر سے بچنے کے لیے مسنون دعاؤں کا اہتمام کریں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں، کیوں کہ جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جب ہم بیمار پڑتے ہیں تو وہی ہمیں شفا دیتا ہے۔ ایک شاعر اس حقیقت پر یوں رقم طراز ہیں:

وہی تکلیف دیتا ہے وہی شفا
وہ بڑا رحیم ہے، کرے سب کا بھلا

نوید : احمد بھائی آپ نے بہت عمدہ معلومات دی ہیں۔ آپ کی ان باتوں سے مجھے بہت رہنمائی ملی ہے۔ آپ کا بہت شکریہ

احمد : بیالو جی کا لیکچر شروع ہونے والا ہے تو ہمیں اب چلنا چاہیے۔

نوید : جی، آئیں جماعت میں چلیں۔

(دونوں دوست جماعت کے کمرے کی طرف چلے جاتے ہیں۔)

80 پاکستان کے معاشی حالات پر دو طلبہ کے مابین مکالمہ
(یا) پاکستان کے معاشی بحران اور آئی ایم ایف توقعات پر دو طلبہ کے درمیان مکالمہ

(ارشد لائبریری میں اخبار کا مطالعہ کر رہا ہے اور اس کا ہم جماعت صفدر اس کے پاس آتا ہے۔ دونوں میں گفتگو کا سلسلہ اس طرح شروع ہوتا ہے)

صفدر: السلام علیکم۔ میں بھی یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟

ارشد: وعلیکم السلام۔ جی۔ ضرور۔ تشریف رکھیے۔

صفدر: اخبار کا مرکزی صفحہ ذرا مجھے دینا۔

ارشد: (اسے اخبار پکڑاتے ہوئے) یہ لیں۔

صفدر: (مطالعہ کرتے ہوئے) یہ بُری خبر دیکھی ہے آپ نے؟

ارشد: کون سی؟

صفدر: پاکستان کے زرِ مبادلہ کے ذخائر میں تیزی سے کمی۔

ارشد: ہاں۔ میں نے یہ خبر دیکھی ہے۔ اسی لیے پاکستان شدید معاشی بحران کا شکار ہے۔

صفدر: پاکستان کو معاشی بحران سے نکالنے کے لیے حکومت آئی۔ ایم۔ ایف سے مذاکرات تو کر رہی ہے۔

ارشد: لیکن آئی ایم ایف کی سخت شرائط کے نتیجے میں مہنگائی کا ایک طوفان آجائے گا اور عوام شدید متاثر ہوں گے۔

صفدر: حال ہی میں پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافے سے مہنگائی کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔

ارشد: آئی ایم ایف پیٹرولیم مصنوعات، گیس اور بجلی کی قیمتوں میں مزید اضافے کا مطالبہ کر رہا ہے۔

صفدر: ڈالر کی قیمت میں اضافے سے بھی پاکستان کے معاشی بحران میں اضافہ ہوا ہے۔

ارشد: ڈالر کی قیمت بڑھنے سے پاکستان کے بیرونی قرضوں کے حجم میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری درآمدات اور برآمدات بھی بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔

صفدر: پاکستان کے معاشی بحران پر قابو پانے میں عوام بھی کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں؟

ارشد: جی ہاں۔ ہم خود بھی پاکستان کو بحران سے نکالنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ مثلاً پاکستان ہر سال 17 سے 19 ارب ڈالر کی پیٹرولیم مصنوعات درآمد کرتا ہے۔ پیٹرولیم مصنوعات کے استعمال میں کمی کر کے ہم زرِ مبادلہ بچا سکتے ہیں۔

صفدر: لیکن پیٹرولیم مصنوعات کے استعمال میں کمی کس طرح کی جا سکتی ہے؟

ارشد: جن لوگوں کے پاس گاڑیاں ہیں، وہ گاڑیوں کا استعمال کم کر کے پیٹرول اور ڈیزل بچا سکتے ہیں۔ اسی طرح گورنمنٹ کے افسران اور اعلیٰ عہدے داران کو استعمال کے لیے ملنے والے ایندھن میں کمی کر کے بچت کی جا سکتی ہے۔

صفدر: اس سے کتنی بچت ہو سکتی ہے؟

ارشد: اگر حکومت ٹرانسپورٹ کے نظام کو بہتر بنالے اور لوگ ذاتی گاڑیوں کا استعمال کم کردیں تو پیٹرولیم مصنوعات پر آنے والے خرچ میں چالیس فی صد کمی ہوسکتی ہے۔

صفدر: یہ بھی کافی بچت ہے۔ اس کے علاوہ بجلی اور گیس کے استعمال سے بھی تو بچت ہوسکتی ہے۔

ارشد: جی ہاں۔ اسی طرح اگر حکومت باہر سے مہنگے موبائل فونز، مہنگی گاڑیاں، کاسمیٹکس اور لگژری آئٹم منگوانا بھی بند کردے تو ڈالر خرچ کرنے میں کمی آئے گی۔

صفدر: ایک خبر کے مطابق پاکستان نے گزشتہ سال ڈھائی ارب ڈالر کی مہنگی گاڑیاں امپورٹ کی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ پاکستان کی معیشت پر ڈھائی ارب ڈالر کا غیر ضروری دباؤ ڈالا گیا ہے۔

ارشد: اسی طرح گزشتہ سال ڈیڑھ ارب ڈالر کے موبائل فونز درآمد کیے گئے ہیں، جو ایک بہت بڑا معاشی دباؤ ہے۔

صفدر: اسی لیے آئی ایم ایف شرائط میں نرمی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ارشد: ہم آئی ایم ایف کی مدد کے بغیر کس طرح اپنی معیشت کو بہتر بنا سکتے ہیں؟

صفدر: آئی ایم ایف کی مدد کے بغیر فوری طور پر معیشت کو سہارا ملنا مشکل ہے۔ لیکن اپنی درآمدات کو کم کرکے اور اپنی برآمدات میں اضافہ کرکے ہم اپنے معاشی حالات کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

ارشد: درآمدات کو کم کرنے اور برآمدات کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی ملکی انڈسٹری کو فعال بنائیں اور بہتر کوالٹی کی مصنوعات اپنے ملک میں ہی پیدا کریں۔

صفدر: پاکستان میں اس معیار کی مصنوعات تیار کی جائیں کہ انھیں ایکسپورٹ کرکے زرِمبادلہ کمایا جاسکے۔

ارشد: اگر پاکستان میں بین الاقوامی معیار کی مصنوعات تیار کی جائیں تو باہر سے چیزیں منگوانے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

صفدر: لیکن یہ سارے کام فوری طور پر نہیں ہوسکتے۔ اس لیے ہمیں آئی ایم ایف کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔ اور ان کی شرائط کو منظور کرنا پڑے گا۔

ارشد: یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن کچھ کام تو ہم فوری طور پر کرسکتے ہیں۔

صفدر: وہ کیا؟

ارشد: گاڑیوں کے استعمال میں کمی کرنا، بجلی بچانے کی عادت ڈالنا، چائے، کاسمیٹکس اور دیگر لگژری آئٹمز کی خریداری میں کمی کرنا معاشی دباؤ میں کمی کرسکتا ہے۔

صفدر: جی ہاں، درست کہا آپ نے۔

ارشد: اس کے علاوہ سادگی اپنا کر بھی ہم بہت سی بچت کرسکتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، اسلام بھی ہمیں سادہ طرزِ زندگی اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔

صفدر: نبی کریم خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کا فرمانِ مبارک ہے کہ جس نے میانہ روی اختیار کی وہ کبھی محتاج نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم فضول خرچی نہ کریں اور اپنے وسائل کے مطابق خرچ کریں تو ہمارے حالات بہتر ہوسکتے ہیں۔

ارشد: جی، بالکل۔ اگر ہم شادی بیاہ پر غیر اسلامی رسموں پر ہونے والے خرچ کو ہی بچالیں تو ایک خاندان خوش حال ہوسکتا ہے۔

صفدر: اس کے علاوہ ہر تقریب کے لیے نئے سوٹ اور نئے جوتے وغیرہ خریدنا بھی ضروری نہیں۔ اسلامی تعلیمات کو اپناتے ہوئے اگر ہم سادگی سے زندگی گزاریں تو ہم مہنگائی کا مقابلہ بھی کرسکتے ہیں اور ملکی برآمدات میں کمی کرکے ملک کو بھی بحران سے نکال سکتے ہیں۔

ارشد: اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ہمیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہر قسم کے مسائل کو حل کرنے میں رہنمائی دیتا ہے۔

صفدر: بالکل درست۔ ضرورت صرف عمل کی ہے اگر ہم اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے ہوئے اسلام کے مطابق عمل شروع کردیں تو بہت جلد مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ پھر ہمیں آئی۔ایم۔ایف یا اس طرح کے دوسرے اداروں کا محتاج نہیں ہونا پڑے گا۔

ارشد: (اپنی گھڑی پر نظر ڈالتا ہے) فزکس کا پیریڈ شروع ہونے والا ہے، کلاس میں چلتے ہیں۔

صفدر: جی، بالکل، آئیں چلتے ہیں۔

(دونوں دوست کلاس روم کی طرف چلے جاتے ہیں)

روداد نویسی

(امتحانی نقطہ نظر سے مطالعہ)

تعریف اور مفہوم:

روداد فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معانی: (۱) کیفیت، حالت (۲) عدالت کی کارروائی (۳) وہ تحریر جس میں کارروائی درج ہو (۴) رپورٹ

(بحوالہ فیروز اللغات صفحہ 764) (جدید اُردو لغت صفحہ 407)

اصطلاحی طور پر ایسے واقعات و مشاہدات کا بیان ہے جو روداد لکھنے والے کی نظروں سے گزرے ہوں۔

اصول و ضوابط:

روداد دس نمبرات پر مشتمل سوال ہوتا ہے۔ سال اوّل میں عموماً، مباحثہ، مشاعرہ، مذاکرہ یا جلسہ وغیرہ کی روداد لکھنی ہوتی ہے۔ روداد لکھتے وقت حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

۱۔ اگر روداد کسی خاص واقعے یا شخص کی یاد میں ہے تو اس کے متعلق چند سطور میں تعارف کرایا جائے۔
۲۔ تاریخ، مقام اور حاضرین کا ذکر کیا جائے۔
۳۔ مقام کی آرائش و زیبائش اور کیفیت کے متعلق ذکر کیا جائے۔
۴۔ تقریب کے مہمان خصوصی یا صدر کا تعارف کرایا جائے۔
۵۔ تقریب کا آغاز، تلاوت کلام پاک اور نعت سے کرنا چاہیے۔
۶۔ روداد ایسی ہونی چاہیے کہ حقیقت کا گمان ہو۔
۷۔ روداد میں زبان پیچیدہ نہیں ہونی چاہیے۔
۸۔ مہمانِ خصوصی اور بعض اہم شخصیات کی تقاریر کے چند اہم نکات وغیرہ بیان کرنے چاہییں۔
۹۔ روداد امتحانی کاپی کے دو یا تین صفحات پر مشتمل ہونی چاہیے۔